فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۴

ماہ جولائی ۱۹۸۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضمون نگاران معارف

جلد ۱۳۴

ماہ جولائی ۱۹۸۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۱	عبید اللہ کوتی ندوی رفیق دار المصنفین	۲۲۱،۲۸۵
۱۲	حافظ عمیر الصد دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین	۴۰۵
۱۳	جناب فیضان اللہ فاروقی لکچرار شعبۂ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد	۴۳۹
۱۴	مولانا محمد حفظ الرحمٰن مرحوم سابق ناظم جمعیۃ العلمائے ہند	۱۶۹
۱۵	جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی چیرمین اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۰۷
۱۶	جناب [illegible] حسینی کانو، نائیجیریا	[illegible]
۱۷	جناب محمد مسعود انور علوی کاکوروی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۲۵
۱۰	ڈاکٹر نثار احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی	۹-۸۹، ۲۴۵،۳۷۵

شمار	مضمون نگار	صفحہ
	جناب شیخ نذیر حسین ادارۂ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور	۳۸۷

شعراء

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں یونیورسٹی	۷۰
۲	جناب بسنت کمار بسنت لکھنؤ	۷۰، ۴
۳	چندر پرکاش جوہر بجنوری	۱۵۱
۴	ڈاکٹر طفیل احمد مدنی الہ آبادی	۱۵۲
۵	ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر بھیونڈی بمبئی	۴۷
۶	محمد حسین فطرت بھٹکلی	۱۵۱
۷	جناب وارث ریاضی صاحب ایم اے مغربی چمپارن	۱[illegible]۱

جلد ۱۳۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۳ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اب سے تقریباً ۷۵ سال پہلے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تاریخ ہند کی تدوین کا ایک جامع خاکہ پیش کیا تھا، جس کی تکمیل کے سلسلہ میں ملک کے ممتاز مورخوں سے تعاون کے بھی خواہاں ہوئے تھے۔

ان کا تعاون تو حاصل نہ ہو سکا، مگر دار المصنفین کے اندر یہ کام جاری رہا، الحمد للہ کہ اس وقت تک اس کی ۲۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، امید کہ آئندہ یہ ملک کی قومی اور جذباتی یکجہتی میں مفید ثابت ہوں گی، بشرطیکہ ان کا مطالعہ سیاسی زاویۂ نگاہ کے بجائے خالص تاریخی پس منظر میں کیا جائے، ادھر حال ہی میں اس سلسلہ کی تین جلدیں "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں، اسلام میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان کو بھی جاننے کی ضرورت تھی، اس لئے "اسلام میں مذہبی رواداری" کے عنوان سے ایک علٰحدہ جلد مرتب کی گئی ہے، اس میں قرآن مجید اور احادیث میں جو تعلیمات ہیں، ان کو واضح کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکومت کے زمانے میں عیسائیوں کو جو خصوصی مراعات دیں، ان کی تفصیل بتائی گئی ہے۔

جب پورا جزیرۃ العرب فتح ہو گیا تو آپ نے نجران کے عیسائیوں کو یہ حقوق دیے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب ان کے قافلے، ان کے سفراء، انکی عورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسولؐ کی حفاظت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں تغیر نہ کیا جائے گا، اور نہ انکی مورتیں بگاڑی جائیں گی، ان کا کوئی اسقف کوئی راہب، کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے ہٹایا نہ جائیگا، زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی، اور نہ ان پر عشر

لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ (فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص ۷۶)

غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی حکومت کا یہ رہنما اصول بن گیا، اسی پر خلفائے راشدین کا عمل رہا، اور جس مسلمان حکمراں نے اس کی پابندی نہیں کی، اس نے اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کی، اور وہ مسلمانوں کی نظروں میں مجرم رہا، مگر زیادہ تر مسلمان حکمراں اسی کے پابند رہے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی پہلی جلد میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری کا یہ بین ثبوت ہے کہ ان کے عہد میں نظام اراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لئے گاؤں میں ان کی زندگی ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلے تھی، تجارت بنیوں کے ہاتھوں میں رہی اس لئے اس زمانہ میں بنیے سوسائٹی کے ضروری اجزا اسی طرح رہے جس طرح آج کل ہیں، عام ہندوؤں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی، ان کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج ویسے ہی باقی رہے، بعض سلاطین اپنی زندگی میں بہت زیادہ مذہبی رہے لیکن ان کے مذہبی عقائد ملک کے نظم و نسق میں حائل نہیں ہوئے، ان کی عدل پروری میں کوئی مذہبی تفریق نہیں ہوئی۔

محمود غزنوی کی بت شکنی بہت مشتہر کی جاتی ہے، مگر اسی کی معیت میں البیرونی نے ہندوستان آکر ہندو مذہب کو جس طرح سمجھایا ہے، اس کی طرف توجہ کم کی جاتی ہے، اس نے اپنی کتاب الہند لکھ کر مسلمانوں کو یہ دعوت دی کہ وہ ہندو مذہب کو اچھی طرح سمجھیں، پھر صوفیائے کرام کی تعلیم و تلقین سے امیر خسرو ایسے متاثر تھے کہ انھوں نے ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ دنیا کے اور تمام مذاہب سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی اور ہندوؤں کی بت پرستی میں جو اخلاص ہے، اس سے اپنے ہم مذہبوں کو سبق لینے کی تلقین کی۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دوسری جلد میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بابر اپنے جانشینوں کے لئے یہ پیام چھوڑ گیا تھا کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا کر ہر مذہب کے طریقے کے مطابق

انصاف کرو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے، اسلام کی ترویج احسانات کی تلوار سے کرو، اکبر نے اسی پر عمل کیا، اس نے تو دلوں کی تسخیر کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر ایک نیا مذہب قائم کیا، گو اسکی تبلیغ میں ناکام رہا، مگر بقول کے۔ ام۔ پنیکر اس نے اپنے جانشینوں کے لئے اپنی حکمت عملی کے سلسلہ میں تین باتیں چھوڑیں (۱) ریاست قومی بنی رہے (۲) ہندوؤں سے میل ملاپ رہے (۳) پورے ہندوستان کو متحد کیا جائے، جہانگیر اور شاہ جہاں کا عمل ان ہی باتوں پر رہا، کے۔ ام۔ پنیکر نے اعتراف کیا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد تک مغلوں کی حکومت قومی بادشاہت تھی۔

اورنگ زیب متنازعہ فیہ بن گیا ہے، مسلمان اسکو بہت اچھا سمجھتے ہیں تو ہندو اس کو بہت برا تصور کرتے ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تیسری جلد میں ان دونوں رایوں پر مفصل بحث کی گئی ہے، جو ہندو مورخین اورنگ زیب کو بہت برا سمجھتے ہیں، ان کے امام جدوناتھ سرکار ہیں، جنھوں نے اسکو بدترین حکمراں ثابت کرنے میں پانچ جلدیں لکھی ہیں، مگر ان کی تحریروں کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں اتنا تضاد نظر آئے گا کہ وہ جو کچھ پورے زور سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، اسی زور سے دوسری جگہ اس کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔

انھوں نے اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائی کو ہندو مت اور فادر لینڈ کی جنگ کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے، مگر ان کا خود بیان ہے کہ شیواجی کے داداچلاجی کا باپ اُسکے چچا کا لڑکا مادھاجی نرائن اپنے پورے خاندان کے ساتھ اورنگ زیب کے طرفدار رہے، پھر انھوں نے ان مرہٹہ سرداروں کی ایک لمبی فہرست بھی دی ہے جو اورنگ زیب کے وفادار بن کر اس کے دربار کے معزز منصبدار بنے رہے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ جدوناتھ سرکار نے جس کو فادر لینڈ کی جنگ کہا ہے، وہ دراصل ذاتی مفاد کی جنگ تھی۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی ایذا رسانی کی وجہ سے راجپوت مغلوں کے تخت و تاج سے ایسے برگشتہ ہوئے کہ وہ ان سے پھر قریب تر نہیں ہوئے، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے ملک میں امن و امان قائم کر لیا، اور اس کے فتح و تسخیر کے لئے خاص علاقے نہیں رہ گئے، تو ان حالات

میں راجپوتوں کو فوج میں کوئی ملازمت نہیں ملنے لگی، کیونکہ جنگ ہی ان کا پیشہ تھا، ان حالات میں ان کے گھرانوں کے حوصلہ مند افراد اپنے ہی رشتہ داروں اور اپنے ہی گھر کے لوگوں سے لڑنے لگے یا پھر ڈکیتی کرنے پر آمادہ ہوگئے یا پھر اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے لگے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۵۵-۳۵۴) اپنی فال آف دی موغل امپائر کی چار جلدوں میں ہندستان کے مختلف علاقوں میں مرہٹوں اور راجپوتوں کی باہمی خوں ریزی، غارت گری اور سفاکی کی جو ہولناک تصویریں کھینچی ہیں، ان کو پڑھ کر موجودہ دور کے مرہٹوں اور راجپوتوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہونگی؛ یہ مرقع آرائی اس لئے کی گئی ہے تاکہ انگریزوں کی حکومت رحمت الٰہی سمجھی جائے، انھوں نے بہت خوش ہو کر لکھا ہے کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت مصیبت زدہ راجپوتوں کے زخموں پر پھایا بن گئی، مگر ان کو اس کا بھی دکھ ہے کہ راجپوتوں کی مردانگی مغلوں کی حکومت کے زوال کے بعد افیون کھا کر گہری نیند سو گئی، اور ان کی نسل نے انگلستان کی مشرق کی فتح میں ایک فوجی سردار بھی پیش کر کے مدد نہیں کی (فال آف دی موغل امپائر ج ۲ ص ۴۸-۳۴۷)

ایسے متضاد بیانات سے ان کی پانچوں جلدیں پُر ہیں، ان کو اورنگ زیب پر بت شکنی اور مندروں کی بے حرمتی کے الزام رکھنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے، مگر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تیسری جلد میں اورنگ زیب کے جو متعدد فرامین، دستاویزوں اور پروانوں کے متن پیش کئے گئے ہیں، ان سے اس الزام کی پوری تردید ہو جاتی ہے، یہ فرامین اور پروانے خود ہندوؤں کے پیش کئے ہوئے ہیں؛ اورنگ زیب نے بعض مندروں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیاں ضرور کیں، لیکن ان کی نوعیت اسی طرح کی تھی جس طرح کہ ہماری موجودہ حکومت نے امرت سر کے سورن مندر کے خلاف کی ہے؛

جدوناتھ سرکار اس لحاظ سے بھی قابل شکایت ہیں کہ اورنگ زیب پر حملہ کرنے میں اسلام پر بھی حملہ آور ہوگئے ہیں، اپنا ایک باب اسلام کی مذمت میں لکھا ہے، جس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے، جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خالص مذہبی فعل سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیروؤں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرے، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دیکتا'

(ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۶۴-۲۴۸)

انھوں نے انگریزوں کی حکومت میں ایسی تحریریں ان کو خوش کرنے کے لئے لکھیں، اور شاید اسی کے صلہ میں ان کو سر کا خطاب بھی ملا، مگر ان کو ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھتے وقت یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ جب ہندوستان میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی تحریکیں چلیں گی تو ایسی تحریریں کتنی مضر ثابت ہوں گی، اور واقعۃً ہوئیں۔

جدوناتھ سرکار نے جا بجا اس کا اظہار کیا ہے کہ اورنگ زیب بلکہ مسلمانوں کی ریاست و حکومت کے مذہبی تخیل کی وجہ سے ہندوستانی قومیت کا بننا ناممکن ہوگیا، لیکن اپنے اس غلط قسم کے موقف کی تائید میں شروع سے آخر تک جو طنز آمیز، زہرناک اور دل آزار تحریریں لکھی ہیں، کیا ہندوستان کی متحدہ قومیت کے بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں، ان ہی کی مورخانہ تحقیقات کی ہمنوائی اب تک کی جا رہی ہے۔

اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو سب سے پہلے اپنے زمانہ میں جغرافیائی وحدت عطا کی، جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اتنی بڑی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہوئی غزنین سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک ہندوستان کا برصغیر ایک ہی حکم کا تابع ہوگیا، لداخ اور مالابار میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا، صوبہ کا کوئی گورنر خراج نہیں روک سکتا تھا۔ اور نہ اس کی عدول حکمی کرتا، یہاں وہاں کچھ بغاوتیں ہو جاتیں لیکن کسی کی ہمت علیٰحدہ حکومت قائم کرنے کی نہ ہوتی (ج ۱ ص ۸) یہ اس حکمراں کی تصویر ہے جس کو بدترین ثابت کیا گیا ہے، اورنگ زیب نے ملک میں سالمیت پیدا کرنے کی خاطر راجپوتوں، مرہٹوں، بندیلوں، اور پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے

خلاف اسی طرح فوج کشی کی جس طرح گذشتہ ۳۰ سال کے اندر ہماری قومی حکومت نے حیدرآباد، کشمیر گوا، آسام اور سکھوں کے خلاف پنجاب میں کی، ہماری حکومت ایسی محاذ آرائی میں بالکل حق بجانب رہی، تو پھر اورنگ زیب کی معرکہ آرائیاں کیوں نہ حق بجانب سمجھی جائیں، کے ام پینکر نے بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے کی ساری لڑائیاں ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش ہی میں لڑی گئیں۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ مرہٹوں، راجپوتوں اور سکھوں سے ضرور لڑے، مگر ان کی لڑائی میدان جنگ یا قلعوں کے محاصروں تک محدود رہی، کبھی ہندو مسلمان سڑکوں پر نہیں لڑے، ان کی ساڑھے چھ سو برس کی حکومت میں ایسی خونریزی اور غارت گری کی مثالیں نہیں ملتی ہیں جو گذشتہ ۳۰ سال کے اندر جمشید پور، راوڑکیلا، جبل پور، بڑودہ، مرادآباد، میرٹھ، آسام، بمبئی اور بھیونڈی میں دیکھنے میں آئیں، خود حکومت کے ایک اعلان میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۱ء تک چار ہزار دو سو اڑسٹھ ہندو مسلم بلوے ہوئے ۱۹۸۲ء کی تعداد چار سو چوہتر تھی، یعنی ایک سال میں فساد کا اوسط روزانہ ایک سے بھی زیادہ رہا، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے طویل دور میں صرف فرخ سیر کے عہد میں احمدآباد میں ہولی کے موقع پر ہندو مسلمان کا ایک جھگڑا ہوا جو سختی سے دبا دیا گیا۔ (سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۹۸)

مسلمانوں کی حکومت کے زمانے کے جزیہ کے ٹیکس کی بڑی مذمت کی جاتی ہے، لیکن اس کی نوعیت کو کھلے ذہن سے سمجھا جائے تو یہ غیرمسلموں کے لئے نعمت سمجھی جائے گی، اس ٹیکس کے ادا کرنے کے بعد غیرمسلموں کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی جائداد، ان کی عبادت گاہیں، ان کے مذہبی پیشوا، ان کے مذہبی تہوار، ان کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج، اور ان کے پرسنل لا وغیرہ سب محفوظ ہو جاتے ہیں، ان کی پوری حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکمران اور عوام پر ہو جاتی ہے، اس فرض کی کوتاہی پر مسلمان حکمراں اور عوام دونوں قابل مواخذہ

سمجھے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیکولر حکومت اپنے مسلمان شہریوں پر اسی قسم کا جزیہ عائد کر دے اور اس کی ضامن بن جائے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لے کر کہیں بھیونڈی کی طرح ان کی جان کی ہوش ربا خونریزی اور مال کی انتہائی بھیانک غارت گری نہ ہونے دے گی، تو مسلمان خوشی سے اس جزیہ کی بڑی سے بڑی رقم دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

اوپر کے۔ام۔پینکر کے اس خیال کا ذکر آیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد تک بادشاہت قومی بادشاہت تھی، مگر جدوناتھ سرکار نے پورے مغل امپائر کو قزاقی (Brigondage) قرار دیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ جن مورخوں کی آنکھیں تخت طاؤس اور تاج محل یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر خیرہ نہیں ہوتی ہیں، ان کو مغلوں کا امپائر ایک قزاقی معلوم ہوگا، جس پر ایک حسین پردہ پڑا رہا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیانِ ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۵۱)

اس تحریر سے جدوناتھ سرکار کے زمانے کی برطانوی حکومت تو ضرور خوش ہو گئی ہوگی، مگر اس قسم کے اشتعال انگیز بیانات کی چبھن سے ملک کے اندر جو سیاست بنی اس کا اندازہ جدوناتھ سرکار کو بھی ہوا ہوگا، اب بھی ایسے زہریلے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں، جن کی ضرر رسانی برابر دیکھنے میں آرہی ہے، اب جب ہماری حکومت قومی بن گئی ہے، اس کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو بھی سوچنا ہے کہ حکومت قانون، دستور، اکثریت کی مرضی، اور فوج کے ذریعہ سے ضرور چل سکتی ہے، مگر ہر دل عزیز حکومت کا اصلی انحصار دلوں کی تسخیر پر ہوتا ہے، جو نیت کی طہارت اور بے غرضی کے ساتھ عمل کی رواداری، فراخدلی، اور نیک نفسی سے حاصل ہوتی ہے، عداوت و مخالفت کے خارستان کو مہر و محبت کا سبز سبزہ اور شاداب چمن بنانے کی خاطر خود بینی، خود نمائی اور خود سرائی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

مقالات

مستشرقین اور مُطالعۂ سیرتؐ

از
ڈاکٹر نثار احمد صدیقی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی

(۲)

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے،

(۱) جان جاک سیدیلو (Sedillot, J.J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (۱۷۷۷ تا ۱۸۳۲) تھا، متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے۔

(۲) دیورجے (Desvergers, A.N.) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۰۵ تا ۱۸۶۷) اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں، تاریخ ابو الفداء سے سیرۃ النبیؐ کا خلاصہ متن و ترجمہ کے ساتھ ۱۸۳۷ء میں شائع کیا، بلاد عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت، عہد مغلیہ تک، مطبوعہ ۱۸۴۷ء

(۳) ڈاکٹر پیرون (Perron, A) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۰۵ تا ۱۸۷۶) مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام و بعدہ مطبوعہ ۱۸۵۸ء نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی، از جلال الدین ابی سلیمان داؤد مطبوعہ ۱۸۶۰ء (۴)

(۴) گارسن دی تاسی (Tassy Garcin DE) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء) صاحب تصانیف دین اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات و فرائض وغیرہ (۵) جوزف وہائٹ، (White J.) انگریز مستشرق، زمانہ (۱۷۴۶ تا ۱۸۱۴ء) اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات و محاضرات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر خطبات (۶) ولیم رائٹ (Wright, W.) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ (۱۸۳۰ تا ۱۸۸۹ء) (۷) ایڈورڈ ہنری پامر (Palmer, E.H.) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۰ء، زمانہ (۱۸۴۰ تا ۱۸۸۲ء) (۸) ڈی جونگ (Jong, de) ہالینڈ کا مستشرق زمانہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۰ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Goeje, M.J. DE) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا، متن اور لاطینی میں ترجمہ لیڈن سے ۱۸۸۱ء میں شائع کرایا (۹) ڈی جوجے، ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء ۱۹۰۹ء) کثیر التصانیف، وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی (۱۰) فلائشر (Fleischer H.L.) جرمن مستشرق تھا، زمانہ (۱۸۰۱ تا ۱۸۸۸ء) متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابی الفداء کو متن و ترجمہ کے ساتھ اور تعلیقات و حواشی سے آراستہ کرکے لیپزگ سے ۱۸۳۱ء میں شائع کرایا، ایک اور کتاب تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپزگ سے اسی سنہ میں چھپی (۱۱) وسٹنفیلڈ (Wusten Feld, F) جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۰۸ء ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف تاریخ مکۃ المکرمۃ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات و حواشی (تین جلدیں) آثار مدینہ منورہ اور تاریخ اشراف مکہ وغیرہ کتابیں اس کی یادگار ہیں (۱۲) بیریزین (Beresine, N) مشہور روسی مستشرق (۱۸۱۸ء ۱۸۹۶ء) گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل، متعدد تصانیف، مصادر اسلامی تہذیب و تمدن

اور اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم و آداب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں (۱۳) بلانکو (White Joseph Blanco) مشہور مستشرق، برطانوی مذہبی مصنف (۱۷۷۵ء تا ۱۸۴۱ء) مستند پادری، خاص کام کا میدان، اندلس کی تاریخ تھا (۱۴) ایڈورڈ سخاؤ مشہور و معروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان داں تھا، بقول مولانا شبلیؒ، پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط، سیرت نبویؐ میں کوئی تالیف نہیں شائع ہوئی (۱۵) اسلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، سرخیل مستشرقین روس میں سے ایک تھا، زمانہ (۱۸۲۸ء ۱۹۰۲ء) وطن لبنان، کام فرانسیسی میں کیا، سیرۃ نبویؐ اور اسلام تعلیمات پر تصانیف (۱۶) فان کریمر (Voncremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی تعلیم بھی وہیں پائی، ترقی کرکے وزارت کے درجہ تک پہونچا اور وفات تک وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کرکے شائع کیا، ان میں سے واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، انشوان کا قصیدہ الحمیریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارہ میں کثرت سے کتابیں لکھیں، جو جرمن زبان میں ہیں (۱۷) سر ولیم میور، مشہور انگریز مستشرق، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے، (۱۸) مینارڈ (Meynord, B. DE) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۲۷ء ۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کر دیا جغرافی، تاریخی، ادبی لغت مرتب کی، مسعودی کی مروج الذہب کا متن و ترجمہ شائع کیا (۱۹) رینی باسے (Basset, Rene) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۵۵ء ۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں کا

مصنف مثلاً الشعر العربی قبل الاسلام، مطبوعہ ۱۸۰۸ء بوصیری کا قصیدہ بردہ، نقد شرح مع ترجمہ
مصنف وغیرہ وغیرہ (۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon, D.G.) فرانسیسی مستشرق مشہور عالم طبیب
اور تمدن و حضارتِ مشرق کا جاننے والا، مورخ تھا، ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا، متعدد ضخیم کتابیں لکھیں،
تمدن مصر، تمدن عرب اور اندلس میں عربی تمدن پر کام قابل ذکر ہے، اس کا شمار ان مغربی مستشرقین میں
ہوتا ہے، جو انصاف پسند تھے، اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے (۲۱) گولڈ زیہر، ہنگری کا مشہور
و معروف مستشرق (۱۸۵۰ء ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف شخص تھا، قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت پر
بے شمار دراسات شائع کیے، گولڈ زیہر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولدکی کے نقدِ حدیث سے آگے
بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا، انکار حدیث کے بعد گولڈ زیہر نے سیرت کے دوسرے
مصادر کو بھی نشانہ بنایا (۲۲) ولہاوزن، جرمن مستشرق (۱۸۴۴ء ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف
یادگار چھوڑیں، مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد مدینہ میں، دینِ اسلام کے مطالعات،
عہد نبویؐ میں دستور مدینہ، مکاتیب نبویؐ اور وفود، منقول از ابن سعد مع متن و ترجمہ، وہ پروٹسٹنٹ
تھیولوجین اور بائبل پر عبور رکھتا تھا (۲۳) واشنگٹن ارونگ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق
(۱۷۸۳ء ۱۸۵۹ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، خصوصاً سیرت محمدؐ اور خلفاء پر
دو جلدیں جو سنہ ۱۸۴۹-۵۰ء میں شائع ہوئیں، اس کی کتاب حیاۃ محمدؐ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا،
(۲۴) یوجین یونج (Eugen -younge) فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف،
ایک ضخیم رسالہ نور اسلام کی خاص کرن، دوسرا مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا،
سیرۃ نبویؐ بزبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ، انتقال سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرونِ وسطیٰ کا مسیحی دماغ
بھی بدلتا چلا گیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اگرچہ ان کے عزائم، اور مقاصد میں

فرق نہیں آیا، تاہم دینِ اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک
یکساں نہیں رہا، اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی، مجموعی طور پر ان کے ظاہری
رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا، اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب
اور تشدد کی انتہا پسندی، خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہوگی،
بہرحال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

عہد جدید پچھلا دور جو بیسویں صدی کے ربع اول میں اختتام کو پہونچا، جیسا کہ ظاہر ہوا،
تحریک استشراق کا نقطۂ کمال ثابت ہوا، اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں نے فروغ
پایا، اب وہ دور جسے ہم عہد جدید سے تعبیر کرسکتے ہیں، بیسویں صدی کے ربع اول سے شروع
ہوا اور تاحال جاری و ساری ہے۔

عہد جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا اور سیاسی و عسکری اور معاشی
و سماجی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر و زبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی
و مغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات، نوآبادیاتی علاقوں کی بیداری، ظلم و استحصال کی تاریکیوں کے
خلاف حریت و آزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست و ریخت، ایجادات و اختراعات کا
ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب و تمدن کے تنوع نے حالات و مسائل
کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا، ادھر استشراق کے حوالہ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ تحریکِ استشراق
پچھلے دور میں جس نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوال کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی
ممکن نہ رہی، اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریک استشراق روبہ زوال ہوگئی ہے؟
واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کرلیا گیا تھا، اسے بہر طور
باقی رکھا جائے، دوسری طرف اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور عالمِ اسلام کے اعمال و احوال میں زیادہ

انہماک، توجہ اور امعان نظر، برتا جانے لگا، جزوقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علمائے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے اسلامی و مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں، یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہیں تھا، مگر ان کے اشتغال و انہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے، کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے، اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے۔

مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت، جسے ویل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری و ساری رہی اور الفانسو، آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہاپسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب اور اشاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا، بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملہ میں اپنی محنت و ریاضت سے ایک طرح کی اجارہ داری حاصل کرلی، اور دوسری طرف، اسلامی و مشرقی مصادر پر نقد و جرح کے کام کو بھی وسیع پیمانہ پر انجام دیا جانے لگا، یہ غالباً تحریک استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مصادر و ماخذ کا اعتبار اسی طریقہ سے اٹھ سکتا تھا۔ اور مشرقی اذہان و قلوب میں تشکک و تذبذب کے بیج بوئے جاسکتے تھے، اس ضمن میں قرآن، سنت اور دوسرے مصادر سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور مآلِ کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس کچھ مفاد پرست، سیاسی رہنما تھے، اور مذہبی خلوص و سچائی ان میں بہت کم تھی،

اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے، ان میں سے چند قابل ذکر ہیں۔

بعض مستشرقین نے سیرت نبوی کا مطالعہ طبی اور معالجاتی (Pathological) نقطۂ نظر سے کیا، کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہوکر آنحضرت صلعم کو محض

ایک معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے اہمیت دی، اور کچھ نے ان سب سے مرکب و مرتب نظریہ قائم کیا، یہ تمام نقطہ ہائے نظر دراصل مخصوص ذہنی و فکری پس منظر کی پیداوار تھے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ موقف قائم کیا گیا کہ آنحضرت (خاکم بدہن) نفسیاتی و دماغی امراض کا شکار تھے، انھیں مرگی کے دورے پڑتے تھے، اور ہسٹری لانس کی دریافت یہ ہے کہ یہ دورے حد درجہ شہوت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی مشہور برطانوی مستشرق اسپرنگر بھی کرچکا تھا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرچکا تھا کہ خدانخواستہ آنحضرت کا نظام اعصاب چونکہ مختل تھا، اور آپ نعوذ باللہ ہذیان و اضطراب اعصابی کے مریض تھے، اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اور ان کی سیرت میں ان کی کارفرمائی نظر آتی ہے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر کو مزید تقویت، مطالعۂ سیرت میں علم النفس کے اصول کو اطلاق سے ملی، اس کے تحت اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوشش کی گئی اور اس معاملہ میں فرانز بہل (Frants Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) نے سبقت دکھائی، اور حق ترجمانی ادا کیا۔

زیر بحث دور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان میں اشتراکی نقطۂ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے، مارکس اور اینجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے اپنا حلقۂ اثر پیدا کیا اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت و فروغ اور پیغمبر اسلام کی کامیابیاں دراصل سیاسی سماجی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں، چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ گرائم (Hubert Grimme) کا نام معاشی نظریہ کے ارتقاء کی علامت بنا، اسلام اور پیغمبر اسلام پر اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں، اس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا، کہ اسلام کو ایک مذہبی و دینی نظام کی بہ نسبت

ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے، اور آنحضرتؐ کو پیغمبر کے بجائے صرف ایک سیاسی، سماجی اور معاشی مصلح سمجھنا چاہئے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مار گولیوتھ نے اور گہرا کیا، اور اس نے اپنے مطالعہ سیرت میں آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی راہنما کی حیثیت سے پیش کیا، اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ مکہ میں اپنی دکان سے لے کر مدینہ میں ایک مملکت کی تعمیر تک تئیس (۲۳) سال کا عرصہ لگایا، پھر دریدہ دہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضورؐ کو نعوذ باللہ ڈاکوؤں کا سردار اور مدینہ کا ظالم اور مستبد لکھنے میں بھی تکلف نہیں کیا، اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی نے اپنے دیو ہیکر کام کا ما حصل یہ قرار دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس ایک چالاک سیاست داں تھے، اور انھوں نے معاشی و سیاسی مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ (خاکم بدہن محمدؐ کے مفاد پرست تھے، اور اپنی سیاست بازی میں انھوں نے اپنی مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیا تھا) مطالعہ سیرت میں، انتہا پسندی، خلاف حقیقت بھی تھی اور خود گردہ مستشرقین میں سے بھی بعض نے اسے پسند نہیں کیا، تاہم مستشرقین نے بین بین رویہ اختیار کیا، مثلاً عہد جدید کا مشہور مؤرخ ٹائن بی اپنی عظیم الشان تصنیف مطالعہ تاریخ میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے، اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارہ میں بھی عمومی طور پر معقول رویہ کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب سیرتِ رسولؐ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ کی حیات طیبہ کو دو (۲) مراحل میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے، جب کہ آنحضورؐ کا قیام مکہ میں رہا، اس دوران میں بقول ٹائن بی آپ کلیۃً مذہبی تبشیری سرگرمیوں میں منہمک رہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں مدینہ پہونچ کر انھوں نے بقول ٹائن بی، مذہبی مقاصد سے الگ ہو کر سیاسی سرگرمیوں کو جاری کیا، وہ بہرحال اس خیال کی پر زور تردید کرتا ہے کہ آنحضرتؐ ایک بہروپیا تھے، ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہو کہ اس کے

نزدیک حضرت مسیحؑ ایک مثالی پیغمبر تھے، بلا شبہ حضورؐ کی زندگی، آپ کی حیات طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے، اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث و سیر کے ذخیرے میں بہرحال ایک حصہ ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر درست تسلیم کیا جا سکتا ہے، اسی قسم کا نقطۂ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے، مطالعہ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں تحریر کیں، واٹ کی تصنیفات کو بہرحال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی، اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی، واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس (۵۰) سال میں "علمیت" نے جو ترقی کی ہے اس کا مظاہرہ اس کی تصانیف میں نظر آتا ہے، اور اس کی تصانیف اسلامی ماخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح و تنقید کے جدید اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کا موقف ٹائن بی کے موقف سے زیادہ مختلف نہیں ہے، کہ وہ بھی آنحضرتؐ کی شخصیت کو مکہ اور مدینہ میں مختلف سمجھتا ہے۔

بہرحال عہد جدید کا یہ عمومی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہد جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے انداز تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہو گئے ہیں، اور بہت سے معاملات میں انھوں نے بالکلیہ رجوع کر لیا ہے، تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم، تحریک استشراق کا اصل محرک جذبہ ابھی کارفرما حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ عہد جدید کا ایک مصنف فرانسیسکو جبرئیلی اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ "پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری ہے"۔ علاوہ ازیں اس صورت حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے، کہ استشراق اور اس کی تحریک کا اہتمام و انضباط، بنیاد دی.

طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا (اورنٹیلزم ص ۲۰۱، ۲۰۳)
اور استشراق کو جہانِ مشرق پر اس وقت مسلط کیا گیا، جب کہ مشرق، مغرب کے مقابلہ میں مغلوب
ومنفعل تھا، اور پھر "قوت وضعف" کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج پیدا کر دیئے، (ایضاً
ص ۲۰۴) استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رخ ہیں ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو
(Latent) اور دوسرا ظاہری، خارجی رخ (Manifest) پہلا داخلی رخ تو
ہمیشہ سے ایک ہے، جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا، جب کہ دوسرا ظاہری پہلو، متغیر ہوتا رہا۔
یعنی مشرقی معاشرہ وتہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارہ میں خیالات وافکار
بدلتے رہے، مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کے حوالہ سے آتی رہی،
لیکن داخلی جذبۂ استشراق ہمیشہ سے آج تک یکساں محکم ومستحکم رہا، اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا
نہیں ہوا، (ایضاً ص ۲۰۶) بہرحال خلاصہ یہ کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ اور سلوک
ودستور کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ موثر علمی روایت ہے، (ایضاً ص ۲۰۳)

عہد حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے، کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین
کا تعارف پیش کر دیا جائے۔

(۱) مونٹے (Montet, ed) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۷ء) اس کی علمی یادگاروں میں اسلام
حال ومستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۱ء) الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۱۳ء)
اور فرانسیسی میں ترجمۂ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں (۲) گاڈ فرے ڈی ممبائن
(Goude Frey De Mombynes, M.) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۲ء
۱۹۵۷ء) پیرس میں مشرقی علوم والسنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف
مثلاً اسلام میں نظم (۱۹۳۱ء) مکہ ومدینہ (۱۹۱۸ء) عالم اسلامی اور بازنطینی صلیبیوں تک

(۱۹۳۱ء) وغیرہ (۳) کارلو الفانسو نلینو، اطالوی مستشرق، زمانہ (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۸ء)
بے شمار مصنفات ومطبوعات اس سے منسوب ہیں، مثلاً منتخبات القرآن (لیپزگ ۱۸۹۳ء)
اسلام سے پہلے قبائل عرب کی تکوین وترتیب (۱۸۹۳ء) تاریخ یمن قبل اسلام (۲، ۱۹۰۲ء)
ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل،
وتراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ
اور حیات محمدؐ جو اس کے انتقال کے بعد روم سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ (۴) سر تھامس
آرنلڈ، انگریز مستشرق، زمانہ (۱۸۶۴ء تا ۱۹۳۰ء) اس کی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام
ہے، (مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء) (۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault, -
Robert) برطانوی مستشرق، انگریز مترجم اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب "دی میکنگ آف
ہیومینیٹی" تھی (۶) اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق . . . .
(زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۹۳۱ء) مورخ ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ
(۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۲ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے۔ (۷) نکلسن، مشہور برطانوی
مستشرق، متعدد تصانیف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن ونیویارک ۱۹۰۷ء)
اور اس کا مضمون محمدؐ اور قرآن، نیز محمدؐ کی ایک نامعلوم سوانح، نکلسن کا زمانہ (۱۸۶۸-۱۹۴۵ء)
ہے (۸) نولدیکے، مشہور جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء) تصنیفات زیادہ تر سامی
زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث، نقد حدیث کے اسکول کا
سرخیل، سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ ۱۸۶۳ء) (۹) ہرگرونج (Hergronje
S, H.) ہالینڈ کا مستشرق زمانہ (۱۸۵۷-۱۹۳۶ء) اس کے آثار ہیں، مکہ کا حج، فقہ
اسلامی اور سیاست نبوی شامل ہیں، مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں، ماہر اسلامیات

سمجھا جاتا تھا، اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتدا سے ہی سیاسی مذہب تھا، بہر حال اسے اسلام کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں، اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق متصور کیا (۱۰) ونسنک، ولندیزی مستشرق (۱۸۸۲ء، ۱۹۳۹ء) اس کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارہ میں رسول اللہ صلعم کا موقف، جو اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بھی تھا، اور لندن سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، نیز محمدؐ اور یہود الاسلام (مطبوعہ ۱۹۱۱ء) وغیرہ خاص کتابیں ہیں (۱۱) زاخاؤ، جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۴۵ء ۱۹۳۰ء) جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی، (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۹۲) (۱۲) جوزف ہورووز (Horovitz, J.) جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۷۴ء، ۱۹۳۱ء) اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا مطبوعہ ۱۸۹۸ء) (۱۳) جوزف ہیل، جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۷۵ء، ۱۹۵۰ء) آثار میں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے (۱۴) کارل بروکلمان، جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۶۸ء، ۱۹۵۶ء) بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف، تاریخ اقوام مسلم ہے، اس میں آنحضرتؐ پر تحریر قابل ذکر ہے، (۱۵) بارتھولڈ، روسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۹ء ۱۹۳۰ء) تصانیف کثرت سے ہیں، مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام، خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ، (۱۶) سموئل زویمر (Zewe-mer. S.) امریکی نژاد، اجل علما مستشرقین، اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر، اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلاد عرب، دنیا میں اسلام حیات محمدؐ، اسلام صحرائے عرب میں اور ورثہ نبویؐ وغیرہ ہیں (۱۷) ایچ جی ویلز، انگریز مستشرق، زمانہ (۱۸۶۶ء، ۱۹۴۶ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ، متعدد تصانیف یادگار ہیں،

خصوصاً دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، ہیں محمدؐ اور اسلام (۱۸) گب، اس عہد کا مشہور ترین برطانوی مستشرق، ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا، اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے، گب کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں، تاہم اصل شہرت کتاب محمڈنزم سے ہوئی جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی، کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے خود توجیہات پیش کی ہیں لیکن یہ نام و توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں، معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ گب کے یہاں مختلف نظریات تصورات اور خیالات میں ارتقاء واقع ہوا، اور وقت و حالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے، اپنی عمر کے آخری ایام میں بہر حال اس نے اسلام کے بارہ میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔ (۱۹) ولفریڈ کینٹویل، اسمتھ، گب کا شاگرد، جولائی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوا، پی، ایچ، ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں ایک اور مستشرق فلپ، کے، ہٹی کی زیر نگرانی تحقیقی مقالہ مجلۃ الازہر، تجزیہ و تنقید پر حاصل کی، مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف، حال پروفیسر میکیلن ڈلہوزی، یونیورسٹی کناڈا، (۲۰) جوزف شاخت، جرمن مستشرق، پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی، خالص یہودی، اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں لیکن اصل کام قانون اور اصول فقہ اسلامی پر ہے (۲۱) برنارڈ لوئیس، عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق ۱۹۱۶ء میں لندن میں پیدا ہوا، تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں عربس ان ہسٹری، اسلام ان ہسٹری، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار ہے۔ اسلام دشمنی کے لیے مشہور و معروف ہے۔ اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں سرفہرست ہے۔

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجۂ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن تحریکِ استشراق کے کیف و کم کا اندازہ

لگانے کے لیے کافی ہے، اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریک استشراق اپنے آغاز اور عروج و ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار سے دوچار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا مستشرقین کی نوجوان نسل، زمانہ کے حالات و وسائل کے پیش نظر ذہن و فکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہو رہی ہیں اور بعض جدید مفکرین و مصنفین مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مد و جزر پیدا کر دیا ہے، پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ اب طاقت و قوت کے سارے اوزان و پیمانے بدل گئے ہیں، استعمار اور استحصال کی لغات بدل گئی ہیں، علمی و ذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر، فلک فضا اور زمین دیکھ رہا ہے، ایسے میں کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کا بگل بجا دے، اس لیے بقول ایک مصنف "وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین و علماء اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین و مخالفین اسلام کے خلاف، علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آرا ہوں، البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ دعوی نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریب نظر (Myth) ہے"۔ (جانسن، ملی ٹینٹ اسلام ص ۸۵ لندن ۱۹۷۹ء)

اسباب و محرکات | تحریک استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے، اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، اور بین السطور تحریک کے اغراض و مقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہو چکی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات و اسباب کو صاف صاف بیان کر دیا جائے، چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اسلام اور ادیان غیر میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اسلام کا نظریۂ حیات اس کا نظام فکر و عمل، اس کے تہذیب و تمدن کا اظہار یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے، پھر دانائے سبل، ختم الرسل نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس نے روز اول سے ہی ادیان باطلہ کی نفی کر دی تھی، . . . .

. . . . ، اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارہ میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں، اور اپنے بغض و عناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت و قساوت دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ "تم دیکھو گے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں، اور مشائخ بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ (مائدہ)" جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں، یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں، ان کو اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں، بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان، اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔

(۲) نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا، اور اسکے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے

اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیائے مغرب آج تک انگشت بہ دنداں ہے، خاص طور پر اس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم و فارس کا سر غرور سے یوں سرنگوں کیا، کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا، بہر حال اسلام کی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت و اشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی و نظریاتی رفعتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پہ مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے، شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر و زبر کر دیا، اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی، یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

(۳) محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریک استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا، صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام و نامراد ہوئیں اور ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک کے معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔ اس لیے انھوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی و فکری محاذ کو منظم کیا جائے، یہی فیصلہ بالآخر تحریک استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ایلنبی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے، کہ "فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں، مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے، ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ

باقی رہیں گے۔"

ایک فرانسیسی PierreMartino اپنی کتاب میں لکھتا ہو کہ جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے، یہاں تک کہ انھوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدانِ ادب میں لے لیا۔ "چنانچہ تحریک استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں۔ اور اس طرح تحریک استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ واقعتہً عسکری محاذ پر ان کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ...... خطرناک ثابت ہوا۔ مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لو دینے لگیں، اور رفتہ رفتہ ان کی آتشِ عداوت دامنِ مشرق کو جلانے لگی۔

(۴) مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں گویا اختلافِ دین و مذہب کی بنا پر ان کے جذبات و خیالات تو پہلے سے ہی، مذہبی بغض و عداوت (Religious hostility) کے آئینہ دار تھے، اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی ماخذ سے دور، صدیوں جہالت و بے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے، اس کا واضح نتیجہ ایک طرف تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظم ﷺ کے بارے میں کم و بیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صرف ظن و تخمین اور وہم و گمان کی پیداوار تھا، چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ و فسوں بھرے قصے، کہانیاں اور اسی طرح کا بلا تحقیقی خام مواد مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے، (جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں بھی سامنے آچکا ہے، اور کچھ جھلکیاں آیندہ فصل میں سامنے آئیں گی) پھر دوسری

جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق و تفتیش میں منہمک ہوئے، تب بھی انھوں نے دانستہ طور پر قرآن و احادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ نیز مشرقی مصادر کی ترتیب و تبویب کے سلسلہ میں، تمام محنتوں کے باوجود، فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے (سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلیؒ ج اول ص ۱۱۰۔۱۱۱) بہر حال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا یعنی تشکک و تذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالمؐ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا اور انھیں آمادہ بہ نفرت کرنا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بقول ایک مصنف "ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظام فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں. انھوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انھوں نے اپنی جولانگاہ کے لئے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انھوں نے خلط مبحث سے کام نہ لیا ہو۔"

(۵) مسلمانوں کا زوال و انحطاط بحیثیت مجموعی تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا، ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ اندلس مسلمانوں کے قبضے سے نکلا، اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب و ثقافت کے تنزل کا باعث ہوا۔ تو اُدھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیکر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے انھیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوام یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا، اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

اس کا نتیجہ واضح تھا، مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار و علوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

(۶) پندرہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی، اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا، اور ان کے ہاں علم و تحقیق بیدار ہی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا، اور انھیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انھوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں، انھیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے، چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں کی تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی، بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں، جو ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھی۔

(۷) مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق سے وابستہ تھے، اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتدا تجارتی تعلقات سے ہی ہوئی تھی، پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ و سفید کے مالک اور حکمراں بن بیٹھے۔ تاہم منڈی والی تجارت میں وہ اب بھی منہمک تھے،

استشراقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کتابوں کی طباعت واشاعت، مورخین کی کتابوں کی جلد فروخت اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ اہل یورپ کے تجارتی مفادات کے تحفظ و فروغ کا باعث بھی ہوا۔

اسباب ومحرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ، تحریک استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے مالہٗ وماعلیہ کو جاننے کے لیے کافی ہے۔ اس لئے اب ہم آگے بڑھکر ایک نظر ان اعتراضات، الزامات اور مفتریات پر ڈالنا چاہتے ہیں، جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادیٔ برحق سید الانبیاء والرسلؐ کی شخصیت وکردار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لئے ان کی تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ (باقی)

مقالات جلد ششم

یورپ میں اسلام، اسلامی روایات، اسلامی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس وبابرکت اور تمام عالم کے لیے باعث رحمت زندگی کے مختلف پہلوؤں پر وہاں کے اسلام دشمن مستشرقوں نے بہت افسوس ناک غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں، مولانا شبلیؒ اپنی زندگی بھر ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع فرماتے رہے، اور ان کے رد میں محققانہ مضامین لکھتے رہے، ایک بڑی غلط فہمی انھوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کے خلاف پھیلا رکھی تھی کہ مسلمانوں نے فتح مصر کے بعد صدیوں کے اس بیش قیمت اور عظیم کتب خانہ کو جلا کر خاکستر کر دیا، مولانا نے ایک مضمون لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مصر میں فاتحانہ داخل ہونے کے صدیوں پہلے جلایا جا چکا تھا، مقالات کی یہ جلد مستشرقین کے اعتراضات کے رد میں اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، قیمت:- ۱۱ر

ترکی کا ایک نامور صحافی

حافظ اشرف ادیب

(۱۸۸۲ء تا ۱۹۷۱ء)

(از جناب ثروت صولت صاحب کراچی)

(۲)

سبیل الرشاد صراط مستقیم کو اشرف ادیب اور ابوالعلاء ماردینی نے مل کر نکالا تھا، اور اسکی ملکیت مشترکہ تھی، کچھ عرصے کے بعد ابوالعلاء ماردینی، یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، اور ان کا تعلق صراط مستقیم سے ختم ہو گیا، اب صراط مستقیم کے تنہا مالک اشرف ادیب ہو گئے، ملکیت میں اس تبدیلی کے بعد نام بدلنا ضروری سمجھا گیا، اشرف ادیب نے عاکف اور عباس حلیم پاشا سے نام کے بارہ میں مشورہ کیا، مختلف نام پیش کیے گئے جن پر اتفاق نہیں ہو سکا، اس پر عباس حلیم اپنے کمرے سے قرآن شریف اٹھا لائے اور کہا کہ اس میں جو نام نکل آئے وہ رکھ دیا جائے، عاکف نے قرآن کھولا، یہ آیت نکلی

"اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ"

چنانچہ سب نے اخبار کا نام "سبیل الرشاد" رکھنے پر اتفاق کیا، اب تک "صراط مستقیم" کے ایک سو اکیاسی ۱۸۱ شمارے سات جلدوں پر مشتمل نکل چکے تھے، ۱۸۲ واں شمارہ "سبیل الرشاد" کے نام سے شایع ہوا، اور اس کے ساتھ آٹھویں جلد کا آغاز ہوا،

سبیل الرشاد کس تاریخ سے نکلنا شروع ہوا؟ اس بارے میں ترکی کتابوں میں صحیح تاریخ نہیں

ملتی: حلمی ضیا اُلکین نے اپنی کتاب "ترکی میں جدید افکار کی تاریخ"[1] میں لکھا ہے کہ "صراط مستقیم" ۱۴ اگست ۱۹۰۶ء سے ۱۶ فروری ۱۹۱۱ء تک جاری رہا، پھر ۲۴ فروری ۱۹۱۱ء سے مارچ ۱۹۲۴ء تک "سبیل الرشاد" کے نام سے جاری رہا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، "صراط مستقیم" ۱۹۰۶ء میں نہیں بلکہ ۱۹۰۸ء میں نکلنا شروع ہوا تھا، بعض کتابوں میں اشاعت کی تاریخ ۱۱ اگست دی گئی ہے، ترکی میں اس زمانہ میں ہجری کیلنڈر کے ساتھ یونانی کیلنڈر بھی رائج تھا، جس کی تاریخوں اور موجودہ انگریزی کیلنڈر کی تاریخوں اور سال میں فرق ہے، مصنفین سے عام طور پر ان میں مطابقت پیدا کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے، یہی "سبیل الرشاد" کے ساتھ ہوا، بہر حال یہ طے ہے کہ "سبیل الرشاد" کا پہلا پرچہ اشرف ادیب کے الفاظ میں "صراط مستقیم" کے پورے ساڑھے تین سال بعد نکلا، یہ ساڑھے تین سال فروری ۱۹۱۲ء میں پورے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ صراط مستقیم کی اس وقت تک سات جلدیں نکل چکی تھیں، اور ہر جلد چھ ماہ پر مشتمل ہوتی تھی، سبیل الرشاد کے پہلے پرچہ کی جو فوٹو کاپی میرے پاس موجود ہے، اس میں جلد آٹھ لکھا ہوا ہے، اس لحاظ سے بھی فروری ۱۹۱۲ء ہوتی ہے، ضیا اُلکین نے مہینہ صحیح لکھا ہے، اور سال غلط، اسی طرح سبیل الرشاد ۱۹۲۴ء میں نہیں، بلکہ ۱۹۲۵ء میں قانون تحفظ عامہ کے تحت بند ہوا، یہاں بھی حلمی ضیا، نے سال غلط لکھدیا، لیکن مارچ کا مہینہ صحیح ہے، لہذا یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سبیل الرشاد کی اشاعت ۲۴ فروری ۱۹۱۲ء سے شروع ہوئی، اور مارچ ۱۹۲۵ء تک جاری رہی، اس کی تائید تورک دیلی و انسی کلو پیدیسی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، کہ صراط مستقیم کے نام سے کل ایک سو اکیاسی ۱۸۱ شمارے نکلے، اس کے بعد ۱۸۲ واں شمارہ سبیل الرشاد کے نام سے نکلا،

---

[1] حلمی ضیا اُلکین: ترکی میں جدید افکار کی تاریخ ص ۲۰۰ (قونیہ ۱۹۶۶ء)

"سبیل الرشاد" اگرچہ "صراط مستقیم" ہی کا دوسرا نام تھا، اور لکھنے والے بھی وہی تھے، لیکن ملکیت میں تبدیلی کے بعد اس کے اغراض و مقاصد کا از سر نو اعلان کیا گیا، اور وضاحت کی گئی کہ جریدے کا کسی فرقہ یا پارٹی سے تعلق نہیں ہوگا، اور صرف حق بات کی حمایت کی جائیگی، اب مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری بجائے عاکف کے اشرف ادیب نے خود سنبھالی، ممتاز لوگوں پر مشتمل ہیئت تحریر تشکیل دی گئی، اور مختلف موضوعات مختلف لوگوں کے سپرد کیے گیے، تفسیر اور حدیث عاکف کے سپرد کیے گیے اور ہدایت کی گئی کہ ان آیات اور احادیث پر زور دیا جائے، جو حیات اجتماعی سے متعلق ہوں، حلیم ثابت[1] کے سپرد فقہ، حج اور خانۂ کعبہ کی تاریخ کی گئی، فلسفیانہ موضوع عمر فرید قام اور شمس الدین گونالتای کے، تاریخ عرب، شریف عبداللطیف انور زادہ کے اور سیاسی مقالات یوسف آقچورہ کے سپرد کیے گیے، اخبار کے لیے مختلف ملکوں میں نامہ نگار مقرر کیے گیے، بلغاریہ میں ممتاز عالم دین احمد حمدی آقسیکی[2] کو جو بعد میں ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ ہوئے، نمایندہ مقرر کیا گیا، کاغذ بھی معیاری استعمال کیا گیا، مختصر یہ کہ "سبیل الرشاد" معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے درجۂ اول کا ایک مکمل جریدہ بن گیا، یہ سب کچھ عباس حلیم پاشا کی مالی امداد کی وجہ سے ہوا،

اسی زمانہ میں روس کے مشہور ترک سیاح قاضی عبدالرشید ابراہیم استنبول آئے،

---

[1] حلیم ثابت متوفی ۱۹۴۳ء کازان (روس) کے رہنے والے تھے، بعد میں اجتہاد کے مسئلہ پر اختلاف ہو گیا، اور سبیل الرشاد سے الگ ہو کر ضیا، گوک الپ کے رسالہ "اسلام مجموعہ" کے ایڈیٹر ہو گیے، مزید حالات کے لیے دیکھیے میرا مضمون "حلیم ثابت" جو المعارف لاہور اکتوبر ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا۔ [2] احمد حمدی آقسیکی (۱۸۸۷ء تا ۱۹۵۱ء) ترکی کے ممتاز عالم دین تھے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ رہے، کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے،

عباس حلیم پاشا کو اسلامی دنیا کے حالات سے بہت دلچسپی تھی، اس لیے اشرف ادیب ان کو لے کر
عباس حلیم پاشا کے پاس گئے، عباس حلیم پاشا نے ایک ہفتہ تک ان سے صلاح ومشورہ کیا،
اور منجملہ اور باتوں کے ان کے سپرد یہ کام بھی کیا، کہ وہ اسلامی دنیا کے ممتاز لوگوں کے جن سے وہ
سیاحت کے دوران ملے، پتے فراہم کریں، جب یہ پتے فراہم ہوگئے تو عباس حلیم پاشا نے ادارے
کو ایک رقم پیشگی دے دی، تاکہ اس سے ان لوگوں کے چندے ادا کرکے ان کے نام سبیل الرشاد
جاری کردیا جائے، یہ سیکڑوں افراد تھے، اور مصر، شام، عراق، حجاز، یمن، ایران، افغانستان،
ہندوستان، ترکستان، روس اور جاپان سے تعلق رکھتے تھے، ان سب کے نام اور پتے کی
پلیٹیں تیار کرلی گئیں، اور ان کے نام سبیل الرشاد جاری کردیا گیا،

اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ اب سبیل الرشاد ایک مکتب ہوگیا تھا، اور اس کا دفتر ایک کلب
بن گیا تھا، عاکف روزانہ دفتر آتے، لکھنے والوں سے ملتے، چائے ایک برتن میں ہر وقت کھولتی رہتی
اور اس کے دور چلتے رہتے تھے، مہمانوں کو پلائی جاتی تھی، عاکف اپنی وہ نظمیں اور اشعار سناتے
جو اگلے پرچے میں شایع ہونے والے ہوتے، ہفتہ کے دن خصوصی اجتماع ہوتا، تمام لکھنے والے جمع
ہوتے، صلاح ومشورے کرتے اور بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے،

"سبیل الرشاد" کو شروع ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگ
بلقان چھڑ گئی، بلقان کی ساری مسیحی ریاستیں سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑیں، حکومت اپنے اندرونی
اختلافات کی وجہ سے جو متضاد عناصر کے جمع ہوجانے سے پیدا ہوگیا تھا، حملہ کا مقابلہ نہ کرسکی، اور
یورپ کے سارے عثمانی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے، اور صرف وہ حصہ باقی رہ گیا، جو اب یورپی
ترکی کہلاتا ہے، عثمانی مقبوضات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، اور لاکھوں بے گھر
ہوگئے، بے گھر لوگ سبیل الرشاد کے دفتر میں آتے، اور مظالم کی داستانیں سناتے، عاکف

کی کئی پر درد نظمیں اسی دور میں لکھی گئیں، اور سبیل الرشاد میں شایع ہوئیں،

جنگ بلقان کے بعد سلطنت عثمانیہ میں صرف وہی علاقے رہ گئے، جن کی آبادی مسلمان
تھی اور جن کے عناصر ترکیبی ترک اور عرب تھے، لیکن ترکوں اور عربوں میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی
نے ان دونوں عناصر کو متحد نہیں ہونے دیا، "سبیل الرشاد" اس دور میں اتحاد اسلام کا سب سے
بڑا علمبردار تھا، اس نے قوم پرستی کے مغربی تصور کی مذمت کی، اور ترکوں اور عربوں کو متحد کرنے
پر زور دیا، قوم پرستی کے فروغ کے ساتھ ہی سبیل الرشاد کے حلقہ ادارت میں بھی نظریاتی اختلافات
پیدا ہوگئے، اور قوم پرستوں کا وہ گروہ جو اسلام کی آزادانہ تعبیر کرنا اور ترک قوم پرستی کی تائید
کرنا چاہتا تھا، "سبیل الرشاد" سے الگ ہوگیا، اور اس طرح سبیل الرشاد کے مضمون نگاروں کا حلقہ
قوم پرستوں اور اتحاد اسلام کے علمبردار دو گروہوں یا تجدد پسندوں اور اسلام پسندوں کے
دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا،[1] تجدد پسندوں نے ضیا گوک الپ اور اتحاد و ترقی کے تعاون سے
"اسلام مجموعہ" کے نام سے ۱۹۱۴ء سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، جس کے ایڈیٹر حلیم ثابت
شبائی (Shibay) تھے، اس گروہ کے دوسرے لکھنے والے شرف الدین یالت قیا[2] اور محمد شمس الدین
گوفالتا ی تھے، لیکن یہ رسالہ چلا نہیں، اور صرف تئیس ۲۳ شماروں کے بعد ۱۹۱۸ء میں بند ہوگیا،
اس موقع پر سبیل الرشاد کی طرف سے اتحاد و ترقی کے مرکز عمومی کے رکن ضیا گوک الپ کو
ایک یادداشت بھی بھیجی گئی، جس میں ترک قوم پرستی کے رجحانات کو مستقبل کے لیے نقصان دہ
کہا گیا تھا، اور یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ متنازعہ امور پر علمی انداز میں گفتگو کرکے مفاہمت کی راہ

---

[1] عدنان آدیوار: علم ودین (استنبول ۱۹۸۰ء) [2] شرف الدین یالت قیا (۱۸۷۹ء
تا ۱۹۴۷ء) احمد حمدی سے پہلے ترکی کے محکمۂ امور مذہبی کے رئیس تھے، تئیس سے زیادہ
کتابوں کے مصنف تھے،

نکالی جائے، لیکن اس یادداشت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا،[1]

آزادی کی جنگ

جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوگئی، اور ان کے سارے عرب مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بند ہوگئی، ۱۵ر مئی ۱۹۱۹ء کو یونانیوں نے اپنی فوجیں ازمیر میں اتار دیں، ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہوگئیں اور ترکوں کو بدنام زمانہ معاہدۂ سیورے کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا جانے لگا، جس کے تحت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا، اب ترکوں کے لیے بقا کا واحد راستہ یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے وطن کی حدود کا دفاع کریں، اس طرح ۱۹۱۹ء سے آزادی کی جنگ شروع ہوگئی، جو ۱۹۲۲ء میں فتح سے ہمکنار ہوئی،

اشرف ادیب نے اس زمانہ میں اپنے پرچے سبیل الرشاد کے ذریعہ آزادی کی جنگ کی حمایت کے لیے قوم کو تیار کیا، ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو استنبول پر اتحادی قبضہ کے بعد وہ عاکف کے ساتھ استنبول چھوڑ کر شمالی ترکی کے شہر قسطمونی آگئے، سبیل الرشاد بھی ان کے ساتھ قسطمونی منتقل ہوگیا، اس موقع پر عاکف نے قسطمونی کی جامع نصر اللہ میں ۱۹ر نومبر ۱۹۲۰ء کو جو پرجوش تقریر کی تھی، اور جس میں انھوں نے معاہدے سیورے کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی عوام سے اپیل کی تھی، ترکی کی جنگ آزادی کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس تقریر کو جنوبی محاذ کے کمانڈر نے ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا، تاکہ عوام کے حوصلے بڑھیں، سبیل الرشاد کے شمارے ۴۶۴ء، ۴۶۵، ۴۶۶ء، اور ۴۶۷ء، عاکف کی اس تاریخی تقریر سے بھرے پڑے ہیں،

اشرف ادیب، سبیل الرشاد کے چند پرچے قسطمونی میں شایع کرنے کے بعد ۲۵ر دسمبر

[1] فوزیہ عبداللہ تنسل؛ محمد عاکف، ص ۵۶ (استنبول ۱۹۷۳ء)

کو عاکف کے ساتھ قسطمونی سے انقرہ منتقل ہوگئے، جہاں آزادی کی جنگ کا صدر دفتر تھا، ان کا قیام بھی عاکف کے ساتھ درگاہ تاج الدین میں تھا، اسی جگہ عاکف نے ترکی کا غیر فانی استقلال مارشی یعنی ترانۂ آزادی لکھا، یہ ترانہ سب سے پہلے سبیل الرشاد کی ۱۷ر فروری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں شایع ہوا، اس کے بعد ۱۲ر مارچ کو ترکی کی مجلس کبیر ملی نے اس کو قومی ترانہ کی حیثیت سے منظور کر لیا،

۱۹۲۱ء کے وسط میں جب یونانیوں نے اسکی شہر اور کوتاہیہ کی طرف سے جوابی حملہ شروع کیا، تو اشرف ادیب نے قیصری جا کر عوام کو جنگ میں شرکت پر آمادہ کرنے کیلئے کتابچے شایع کر کے تقسیم کیے،[1]

۱۹۲۲ء میں آزادی کی جنگ ختم ہوگئی، اور غیر ملکی فوجوں کا آخری سپاہی تک ترکی کی سرزمین سے نکال دیا گیا، اس جنگ میں سبیل الرشاد نے جو کردار ادا کیا، اس کا اعتراف ممتاز ترک ادیب احمد کبیکلی اس طرح کرتے ہیں!

"عاکف نے سبیل الرشاد کو آزادی کی جنگ کے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا تھا، اور انکا یہ نعرہ کہ ہماری قوم جو ڈھائی ہزار سال سے آزادی کی نعمت سے بہرہ ور رہی ہے، غلامی کی زندگی قبول نہیں کر سکتی، ہر طرف گونجنے لگا، یونان کے حملے کے آغاز کے وقت سے آخری فتح حاصل ہونے تک انھوں نے لوگوں کے حوصلے بلند رکھے، اور امید کی شمع روشن رکھی"[2]

ظاہر ہے اس اعزاز میں اشرف ادیب بھی عاکف کے برابر کے شریک ہیں،

مئی ۱۹۲۳ء میں اشرف ادیب انقرہ سے استنبول واپس آگئے، اور سبیل الرشاد

[1] تورک دیل و ادبیاتی انسی کلوپیدیسی جلد سوم ص ۱۹۳ مقالہ فرغن: اشرف ادیب (استنبول ۱۹۷۸ء) [2] احمد کبیکلی: محمد عاکف ص ۳۲ (استنبول ۱۹۷۲ء)

حسب سابق پھر استنبول سے شایع ہونے لگا، لیکن اب وہ اس کو تنہا نکال رہے تھے، عاکف جو صراط مستقیم کے آغاز سے اب تک ان کے ساتھ تھے، نوزائیدہ جمہوریہ ترکیہ کے غیر اسلامی رجحانات سے دل شکستہ اور سنسر کی روز افزوں پابندیوں سے اکتا کر عباس حلیم پاشا کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مصر چلے گیے، اشرف ادیب نے زیادہ مستقل مزاجی کا ثبوت دیا، اور سبیل الرشاد کے ذریعہ اسلام پر کیے جانے والے حملوں کا جواب دیتے رہے، اس زمانہ میں انھوں نے کئی طویل مقالوں کے ترکی ترجمے قسط وار شایع کیے، ان میں ایک سعید حلیم پاشا کا مقالہ "اسلام میں تشکیلات سیاسیہ" تھا، جو ۲۶ فروری سے ۱۳ مئی ۱۹۲۳ء کے شماروں میں شایع ہوا، دوسرا عبدالعزیز چاوش کا مضمون "شراب کا انسانی زندگی پر مضر اثر" اور تیسرا "انگریزی کلیسا کے سوالنامہ کا جواب" یہ بھی عبدالعزیز چاوش کا تھا،

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی ایک جمہوریہ بنا دی گئی، اس کے بعد ترکی کی اسلامی حیثیت کو ختم کرکے اس کو ایک یوروپی ملک بنانے کے لیے مسلسل اقدامات کیے گیے، سبیل الرشاد ان نام نہاد اصلاحات کے خلاف تھا، اور حکومت اس کے خلاف کارروائی کے لیے صرف بہانے کی منتظر تھی، جب ۱۱ فروری ۱۹۲۵ء کو ان نام نہاد اصلاحات کے خلاف مشرقی ترکی میں شیخ سعید نے بغاوت کر دی، تو حکومت نے اشرف ادیب کو گرفتار کر لیا، اور ان کو نو تشکیل یافتہ عدالت استقلال کے سامنے پہلے انقرہ میں، پھر دیار بکر میں پیش کر دیا، اس کے بعد ان کو اس شرط پر چھوڑا کہ وہ آیندہ سبیل الرشاد شایع نہیں کریں گے، اس طرح سترہ سال تک وطن اور اسلام کی خدمت کرنے والا پرچہ مارچ ۱۹۲۵ء میں بند کر دیا گیا، اور جب تک ترکی میں ایک پارٹی کی آمرانہ حکومت رہی، سبیل الرشاد بند رہا، سترہ سال کی اس مدت میں صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کے کل چھ سو اکتالیس [641] شمارے شایع ہوئے،

تصانیف اشرف ادیب اس کے بعد بھی بیکار نہیں بیٹھے، صحافت پر پابندی لگی تو انھوں نے کتب نویسی شروع کر دی، اور آثار علمیہ کتب خانہ قائم کرکے اپنی اور دوسرے مصنفین کی کتابیں شایع کرنے لگے، صحافت پر پابندی لگنے سے پہلے انھوں نے سبیل الرشاد کے دفتر سے متعدد کتابیں شایع کی تھیں، لیکن اب یہ ان کا واحد مشغلہ بن گیا،

۱۔ **محمد عاکف: حیات، تصانیف اور بعض مصنفین کے مضامین:۔** یہ اشرف ادیب کی پہلی اور شاید سب سے اہم اور قیمتی کتاب ہے، اس کی پہلی جلد جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۳۸ء میں، اور دوسری جلد جو تین سو بیس [320] صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۳۹ء میں شایع ہوئی، یہ ضخیم کتاب ان کے دوست، صراط مستقیم کے ایڈیٹر اور ترکی کے شاعر اسلام محمد عاکف کی زندگی اور تصانیف پر سب سے مفصل اور مستند کتاب ہے، اس میں انھوں نے عاکف سے متعلق مختلف اہل قلم کے مضامین بھی جمع کر دیے ہیں، کتاب میں عاکف کی پیدائش سے لے کر ۱۹۳۶ء میں ان کی وفات تک کے حالات اور عاکف کے دوستوں کے حالات شامل ہیں،

۲۔ **انقلاب کے بالمقابل عاکف اور فکرت:۔** توفیق فکرت (۱۸۶۷ء تا ۱۹۱۵ء) ترکی کے مشہور شاعر تھے، شروع میں وہ ہمارے جوش ملیح آبادی کی طرح صاحب ایمان اور دیندار تھے، اس کے بعد الحاد اختیار کر لیا، اللہ، قرآن اور اسلامی روایات کے خلاف اپنی نظموں میں بدزبانی کی، ایک مرتبہ عاکف اور فکرت میں اس موضوع پر بحث بھی چل نکلی تھی، ۱۹۴۰ء میں استنبول کے اخباروں میں یہ بحث پھر چل نکلی، اور ایک کمیونسٹ خاتون صبیحہ سرتیل نے عاکف پر بھی حملے کیے، یہ کتاب اس کے جواب میں ہے، اور ۱۹۴۰ء میں آثار علمیہ کتب خانہ سے شایع ہوئی،

۳۔ **گنجلیک و تان جیلر:۔** یہ کتاب بھی عاکف اور فکرت کے مناقشہ سے متعلق ہے،

کمیونسٹوں نے جو اخبار "تان" کے گرد جمع تھے، عاکف کے ترانۂ ملی پر اعتراضات کرنا شروع کر دیا تھا، اشرف ادیب نے یہ کتاب (نوجوانان اور تان اخبار کا حلقہ) اسی کے جواب میں لکھی اور بتایا کہ ترکی کی آزادی کا سرچشمہ عاکف کا ترانۂ آزادی ہے، توفیق فکرت کی نظم تاریخ قدیم نہیں ہے، جس میں اللہ اور قرآن کو برا بھلا کہا گیا ہے، اور اسلاف پر لعنت بھیجی گئی ہے، یہ کتاب بھی ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی،

۴۔ اسلام ترک محیط المعارف:۔ ۱۹۴۰ء میں ترکی کی وزارت تعلیم نے لیڈن کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ ترکی میں ترجمہ کرنا شروع کیا، اس پر اشرف ادیب نے ۱۹۴۱ء میں ایک کتابچہ شایع کیا جس کا نام میسیونلر و مستشرقلرن یازدقلری اسلام انسی کلو پیدیسی نن علمی ماہیتی (مسیحی مبلغوں اور مستشرقوں کی لکھی ہوئی اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی علمی حیثیت) تھا اس میں انھوں نے مذکورہ انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ کرنے کو نقصان دہ بتایا تھا، اس کے بعد ان کی تحریک پر ایک علمی جماعت نے جو اشرف ادیب، عمر رضا دوغرل، اسماعیل حقی ازمیرلی اور کامل میراث پر مشتمل تھی، "اسلام ترک محیط المعارف" کے نام سے ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنا شروع کر دی، جس کے چوہتر [۷۴] اجزا، شایع ہوئے، اس کے بعد اس کو رسالہ کی شکل دے دی گئی، جس کے ایک سو [۱۰۰] شمارے شایع ہوئے، اس کے بعد کام رک گیا،[1]

۵۔ پنبہ کتاب (سرخ کتاب):۔ یہ چونسٹھ [۶۴] صفحہ کا ایک کتابچہ ہے جس میں اشرف ادیب نے چالیس مصنفین کی تحریریں جمع کر دی ہیں، ان میں توفیق فکرت پر پانچ مختلف پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے، آثار علمیہ کتب خانہ نے ۱۹۴۳ء میں شایع کی،

۱؎ تورک دیل و ادبیاتی انسی کلو پیدیسی جلد سوم ص ۱۹۳، مقالہ "اشرف ادیب فرغن"۔

۶۔ چوجقلرامیزہ دین کتابی (ہمارے بچوں کے لیے دینی کتاب) چار [۴] حصے (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء)

۱۹۲۵ء کے بعد جب ترکی میں ایک پارٹی کی آمریت قائم کر دی گئی، قانون تقریر سکون (تحفظ عامہ) کے تحت تمام مخالف اخبارات بند کر دیے گیے، اصلاحات پر تنقید کرنیوالوں پر مقدمہ چلانے کے لیے خصوصی عدالتیں "عدالتہائے استقلال" کے نام سے قائم کر دی گئیں، حزب اختلاف کے اکیس [۲۱] رہنماؤں کو پھانسی دے دی گئی، اور ڈیڑھ سو رہنماؤں کو جلا وطن کر دیا گیا، تو حکومت اپنی مرضی کی اصلاحات ملک پر تھوپنے میں آزاد ہو گئی تھی،[1] اسی زمانہ میں دینی مدارس بند کیے گیے، عربی رسم الخط بدل کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، اذان اور اقامت ترکی زبان میں کہنے کا حکم دیا گیا، اور عربی اذان کو جرم قرار دیا گیا، عورتوں کو پردہ ترک کرنے پر مجبور کیا گیا، ہجری تقویم کی جگہ انگریزی کیلنڈر اختیار کیا گیا، جامع ایا صوفیہ کو میوزیم بنایا گیا، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے قانونی ضابطے نافذ کیے گیے، اور آئین سے یہ دفعہ نکال کر کہ "ترکی کا سرکاری مذہب اسلام ہے" ریاست کو سیکولر ریاست قرار دیا گیا، ان اصلاحات کو اتنی سختی سے نافذ کیا گیا، کہ ان کے خلاف بولنا موت کو دعوت دینا تھا، چنانچہ تفسیر کے استاذ محمد عاطف آفندی کو محض اس جرم میں ۱۹۲۶ء میں پھانسی دے دی گئی، کہ انھوں نے پردہ سے متعلق آیات کی تفسیر بیان کی تھی، اسی طرح دو [۲] اور افراد علی رضا اور حاجی عسکری کو بھی اس قسم کے جرم میں پھانسی دے دی گئی، یہ تینوں افراد نام نہاد عدالت استقلال میں پیش کیے گیے تھے، جو اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر قائم کی گئی تھی،[2] لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود اس پورے دور میں جس

۱؎ تورک دیل و ادبیاتی انسی کلو پیدیسی ج ۱ ص ۳۲۵، ۲؎ صادق البائرق: ترکیہ دہ دین غوغاسی (ترکی میں دینی مناقشہ) ص ۲۱۶-۲۱۸، ایک اور عالم احمد رسم کو عدالت استقلال نے ۱۹۲۸ء میں پندرہ [۱۵] سال قید کی سزا دی، ملاحظہ کیجیے اسی کتاب [illegible]

شخص نے ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر اسلام پر ہونے والی تنقیدوں کا کھل کر جواب دیا، اور اسلامی احکام کی اپنے ضمیر کے مطابق تشریح و تعبیر کی، وہ بدیع الزماں سعید نورسی کی ذات تھی، وہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک مسلسل پچیس سال تک یا تو قید خانوں میں رہے، یا نظر بند، اور اس دوران میں ان پر اور ان کی تحریروں پر سیکڑوں مقدمے چلائے گئے، اشرف ادیب ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، اور شاید وہ پہلے اہل قلم ہیں جس نے آمریت کا دور ختم ہونے کے بعد ان کے حق میں قلم اٹھایا[1]، اشرف ادیب نے اس سلسلہ کی پہلی کتاب:

۷۔ رسالۂ نور مولفی بدیع الزماں سعید نورسی، حیاتی، اثرلری، مسلکی، ۱۹۵۰ء میں لکھ کر شائع کی، اس کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں دو مزید کتابیں بھی لکھیں، یعنی (۸) بدیع الزماں نور و نورجولک، تنقید و تحلیل (۱۹۶۳ء) (۹) رسالہ نور معارضہ یازلرن اسنادلرہ حقندہ علمی بر تحلیل (رسالہ نور پر اعتراض کرنے والے مصنفوں کے الزامات کا علمی تجزیہ) ۱۹۶۵ء،

۱۰۔ قرآن غرب متفکرلرینہ گورہ (قرآن مغربی مفکروں کی نظر میں) ۱۹۵۷ء اس میں اشرف ادیب نے مغربی اہل قلم کی ان تحریروں کو یکجا کیا ہے، جن میں انہوں نے قرآن کی عظمت کا اعتراف کیا ہے،

۱۱۔ دین دہ رفورمجولر (دین میں اصلاحات کرنے والے) ۱۹۵۹ء، ترکی میں قیام جمہوریت کے بعد ہی یہ تحریک چلی تھی، کہ اسلام میں بھی اسی طرح اصلاحات کی جائیں جیسی مغرب میں پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح دین کے تحت کی گئی تھیں، اشرف ادیب نے اس موضوع پر اس

[1] بدیع الزماں سعید نورسی کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے میری کتاب "بدیع الزماں سعید نورسی" شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء،

دور کے ممتاز دانشوروں علی فواد باشگل[1]، نورالدین توپچو[2]، اسماعیل حامی دانشمند[3] اور منیب اوغن کو لکھنے کی دعوت دی، چھپن صفحہ کا یہ کتابچہ ان ہی تحریروں کا مجموعہ ہے، کتابچہ کے شروع میں خود اشرف ادیب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں ترکی میں تحریک اصلاح دین کا پس منظر بتایا ہے؛

۱۲۔ قرا کتاب (کالی کتاب)، اس کتاب میں اشرف ادیب نے بتایا ہے کہ قیام جمہوریت کے بعد ملت کو کس طرح دھوکا دیا گیا، اور دین پر کس طرح حملے کیے گئے، یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی، ۱۹۶۹ء میں اس کی وجہ سے حکومت نے اشرف ادیب پر مقدمہ چلایا، لیکن وہ عدالت سے بری کر دیئے گئے،

اشرف ادیب کی تالیفات میں تین اور کتابوں کے نام ملتے ہیں، ایک (۱۳) حج رہبری، جسے انہوں نے اے علوی اور عاکف کے تعاون سے لکھا تھا، دوسری (۱۴) ارفا کے محمود کامل کے وعظوں کا مجموعہ، اور تیسری (۱۵) مناستر کے اسماعیل حقی کے وعظوں کا مجموعہ۔ یہ اشرف ادیب نے خود مرتب کیے تھے، ان کی تاریخ اشاعت معلوم نہیں ہو سکی،

ان کتابوں کے علاوہ اشرف ادیب کے بے شمار مضامین جو بڑے اہم موضوعات پر ہیں، ابھی تک صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کی فائلوں میں بند ہیں، اگر ان کو جمع کیا جائے تو کئی

[1] علی فواد باشگل (۱۸۹۳ء تا ۱۹۶۷ء) ممتاز ترک مفکر اور قانون دان، آزادیٔ فکر کی تحریک کے علمبردار، فرانس کے فارغ التحصیل تھے، اور ترکی میں دینی تعلیم کے نظام کی بحالی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے،

[2] نورالدین توپچو (۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۵ء) پیرس کی سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا، ترکی میں اسلامی تحریک کے ممتاز مفکر تھے، کئی کتابوں کے مصنف اور اسلامی رسالہ "حرکت" کے ایڈیٹر تھے۔

[3] اسماعیل حامی دانشمند (۱۸۹۹ء تا ۱۹۶۷ء) ممتاز ترک مورخ تھے،

جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، مثلاً عدالت استقلال میں اشرف ادیب پر جو مقدمہ چلایا گیا، اس کی روئیداد پچاس[۵۰] قسطوں میں شایع ہوئی ہے، ترکی کی جنگ آزادی میں سبیل الرشاد کے کردار پر اشرف ادیب کا مضمون تیس[۳۰] قسطوں سے زیادہ میں چھپا ہے، ان کا ایک اور اہم مضمون تنظیمات کے اصلاحات کے بارے میں ہے، جس کی انتیسویں[۲۹] قسط سبیل الرشاد ستمبر ۱۹۵۲ء میں موجود ہے، معلوم نہیں اسکے بعد کتنی قسطیں اور شایع ہوئیں،

سبیل الرشاد کا آخری دور ترکی صحافت کی تاریخ میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ پابند صحافت کا زمانہ کہا جاتا ہے[1]، یہ وہ زمانہ ہے جب سرکاری جمہور خلق پارٹی یا پیپلز ری پبلکن پارٹی بلا شرکت غیرے حکمراں تھی، اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا تھا، اس دور میں صرف اخبارات ہی نہیں، تمام مطبوعات پر حکومت کی کڑی نگرانی رہی، لیکن اس کے بعد سیاسی پارٹیاں قائم کرنے اور آزادانہ اظہار رائے کی آزادی بحال کر دی گئی، چنانچہ اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشرف ادیب نے بھی یکم مئی ۱۹۴۸ء سے سبیل الرشاد پھر شایع کرنا شروع کر دیا، جو ۱۹۶۶ء تک جاری رہا[2]، لیکن سبیل الرشاد کا یہ دور پہلے دور سے کمتر تھا، اشرف ادیب اپنے مخلص ترین ساتھی عاکف کی خدمات سے محروم ہو چکے تھے، وہ خود بھی بوڑھے ہو چکے تھے، اور پہلے دور کی طرح محنت نہیں کر سکتے تھے، عباس حلیم جیسا کوئی سرپرست بھی موجود نہیں تھا، ذاتی طور پر ان کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ حالات سازگار نہیں تھے، اگرچہ ان کو اخبار نکالنے کی اجازت مل گئی تھی، لیکن آئین میں سیکولرازم کی دفعات اور اس پر عمل درآمد کرانے کے لیے قانون تعزیرات کی

---

[1] تورک دیلی و دیباقی انسی کلوپیڈیسی جلد اوّل ص ۳۲۴-۳۲۷، [2] ایضاً جلد سوم مقالہ اشرف ادیب فرغن۔

دفعات اسلامی بنیاد پر کام کرنے والوں کی راہ میں بہت رکاوٹ تھی، چنانچہ سبیل الرشاد اپنے دورِ ثانی میں معنوی اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے اور کثرت اشاعت کے لحاظ سے دورِ اوّل کے سبیل الرشاد کا مقابلہ نہیں کر سکا، اس زمانہ میں سبیل الرشاد کا ایک شمارہ سولہ[۱۶] صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، بہر حال ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۶ء تک ترکوں کی دینی سرگرمیوں، اور اسلام اور مغربی تصورات کے درمیان ہونے والی کشمکش کا حال معلوم کرنے کے لیے اس دور کا سبیل الرشاد ایک اہم ماخذ ہے،

اس دور میں سبیل الرشاد کی اشاعت بھی بے قاعدہ رہی، میرے پاس اس دور کے سبیل الرشاد کے چوالیس[۴۴] پرچے ہیں، جو جون ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۶۵ء کی مدت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۶۵ء تک "سبیل الرشاد" کے کل تین سو انسٹھ شمارے شایع ہوئے تھے، حالانکہ سترہ[۱۷] سال کی اس مدت میں ایک ہفت روزہ کی حیثیت سے ساڑھے آٹھ سو کے لگ بھگ شمارے شایع ہونا چاہیے تھے، شمارہ ۱۴۹ جو اپریل ۱۹۵۲ء کا ہے، میرے پاس موجود شماروں میں آخری شمارہ ہے، جس میں اندرونی لوح پر "سیاسی، دینی، علمی، ادبی اور اخلاقی ہفت وار مجموعہ" لکھا ہوا ہے، حالانکہ پانچ سال کی مدت میں کم از کم دو سو[۲۰۰] شمارے نکلنا چاہیے تھے، اس کے بعد میرے پاس شمارہ ۱۵۰ سے شمارہ ۲۱۴ تک موجود نہیں، شمارہ ۲۱۴ پر جو فروری ۱۹۵۶ء کا ہے، ہفت روزہ کا لفظ موجود نہیں اور صرف "سیاسی، دینی، علمی، ادبی اخلاقی مجموعہ" لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اشرف ادیب نے حالات کو ناسازگار پا کر ہفت روزہ کو ماہوار کر دیا تھا، لیکن اب ان کے لیے ماہوار رسالہ شایع کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا، ۱۹۶۳ء (شمارہ ۳۵۱) کے بعد شمارہ ۳۵۲ دسمبر ۱۹۶۳ء میں نکلا، اور شمارہ ۳۵۳ اپریل ۱۹۶۴ء میں، اس کے بعد اگست ۱۹۶۴ء

شمارہ ۳۵۷ تک رسالہ پابندی سے ہر ماہ نکلتا رہا، لیکن اس کے بعد پھر خلل پڑ گیا اور شمارہ ۳۵۸ نومبر ۱۹۶۴ء میں نکلا، اور شمارہ ۳۵۹ جو میرے پاس موجود آخری شمارہ ہے مارچ ۱۹۶۵ء میں نکلا، اس وقت اشرف ادیب کی عمر ترا‌سی ۸۳ سال تھی، ۱۹۶۶ء میں سبیل الرشاد بند ہوگیا، ماہوار شمارے بھی سولہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتے تھے،

اس مدت میں اشرف ادیب کی ذاتی زندگی کے دو ۲ واقعات قابل ذکر ہیں، ایک ۱۹۳۲ء میں وہ مصر جاکر اپنے دوست عاکف سے ملے، یہ غالباً ترکی کے باہر ان کا پہلا سفر تھا، دوسرا واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء میں اخبار وطن کے ایڈیٹر احمد امین یلمان پر ملاطیہ میں قاتلانہ حملہ ہے، احمد امین یلمان کو ترک مسلمان عام طور پر دونمہ (یعنی وہ یہودی جو ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوئے ہیں) کہتے ہیں، انھوں نے ترکی کے پہلے مقابلہ حسن کی سرپرستی کی تھی، جس پر کسی شخص نے ان کو قتل کرنے کی کوشش کی، اس واقعہ کے بعد ترکی میں اسلام پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی، ترک قوم پرستوں کی تنظیم ترک ملیت جیلر درنیگی کی تمام شاخیں بند کردی گئیں، اور اگرچہ اشرف ادیب کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان کو گرفتار کرلیا گیا، اور دو ماہ تک قید میں رکھا گیا،

سبیل الرشاد بند ہونے کے بعد اشرف ادیب نے اخبار ینی استقلال (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء) اور بوگون (۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء) میں مضامین لکھے، ۱۹۷۰ء میں روزنامہ ینی آسیا کے مالک مصطفیٰ پولاد کے کہنے پر انھوں نے اپنے خود نوشت حالات لکھنا شروع کیے، لیکن ابھی ۱۹۱۲ء تک ہی پہنچے تھے کہ ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا، یہ حالات ان کی وفات کے کئی سال بعد ینی آسیا میں ۵/ جنوری ۱۹۷۸ء تا ۲۶/ جنوری ۱۹۷۸ء میں بائیس ۲۲ قسطوں میں شایع ہوئے، اشرف ادیب نے توحید افکار، ینی صباح

ملت اور دیانت میں بھی مضامین لکھے،

کتب خانہ سبیل الرشاد سے جسے بعد میں انھوں نے آثار علمیہ کتب خانہ[لہ] کا نام دے دیا تھا، جو اہم کتابیں شایع کیں، ان کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس سلسلے میں اہل پاکستان کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی، کہ اشرف ادیب آخری عمر میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیر الصحابہ رض اور تاریخ اسلام کا ترکی زبان میں ترجمہ کروا رہے تھے، منصوبہ کے تحت یہ کام دس ۱۰ ہزار صفحات پر مشتمل پچیس ۲۵ جلدوں میں پورا ہوتا تھا، اس سلسلہ کی تین جلدیں عصر سعادت کے نام سے ۱۹۶۴ء تک شایع ہو چکی تھیں، اور مہاجرین کے حالات پر مشتمل تھیں، چوتھی جلد سے انصاری صحابہؓ کے حالات شروع ہو رہے تھے، اور اس کا بھی ترجمہ ہو چکا تھا، اور اشرف ادیب نے اس پر ایک مقدمہ ہجرت کی اہمیت پر لکھ دیا تھا، لیکن معلوم نہیں یہ کام بعد میں کہاں تک مکمل ہوا، عاکف کے داماد اور اشرف ادیب کے رفیق عمر رضا دوغرل نے شبلی کی الفاروق کا ترکی میں جو ترجمہ کیا تھا، وہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ بھی غالباً آثار علمیہ کتب خانہ سے شایع ہوا تھا،

[لہ] آثار علمیہ کتب خانہ سے جن ممتاز مصنفوں کی کتابیں شایع ہوئیں، ان میں عاکف، اسماعیل حامی دانشمند، عمر رضا دوغرل اور احمد نعیم کے نام قابل ذکر ہیں۔

اشعار و قصائد کی دینی حیثیت

از

مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر، نیپال

شعر و شاعری کی قیمت اسلام کی نگاہ میں کیا ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیا درجہ دیا ہے؟ اصحاب النبی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اشعار سے کیا دلچسپی رکھتے تھے؟ مندرجہ ذیل تحریر میں ان تمام چیزوں پر کچھ روشنی پڑے گی،

امام بیہقیؒ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل فرماتے ہیں کہ سورہ شعراء میں عام شاعروں کی مذمت کے بعد شعرائے اسلام کو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا الخ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے خود مستثنیٰ فرمایا ہے، حضرت حسان بن ثابتؓ عبد اللہ بن رواحہؓ، کعب بن زہیرؓ شعرائے اسلام اسی زمرہ میں شمار کئے گئے ہیں (بیہقی ج ۱۰ باب شہادۃ الشعراء صـ۲۳۹، ادب المفرد صـ۱۲۷)

ظاہر ہے کہ محاسن اسلام و معارف دین اور نعت النبیؐ سے متعلق دلنشین و موثر مضامین شعروں میں باندھنے والے شعرائے کرام اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ذیل میں داخل ہیں، عموماً صحابہ کرامؓ اچھے ہی اشعار کہتے تھے، امام بیہقی رح لکھتے ہیں کہ ایسے اشعار جو نصیحت آموز ہوں اور اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہوں، اُن کا پڑھنا، سُننا سب مشروع و درست ہے (بیہقی ج ۵ صـ۶۹) شعر میں خواہ عاشقانہ غزل کا لطف نہ آئے اور خواہ کوئی شوخی و تیزی باقی نہ رہجائے مگر اس کے مضامین معرفتِ الٰہی وحبّ رسولؐ و تقویٰ وغیرہ اسلامی تعلیمات ہی سے متعلق ہونا چاہئیں.

بیہقی شریف میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً بعض اشعار میں دانائی کی باتیں ہوتی ہیں، پس در اصل ایسے ہی بصیرت افروز، علم آموز اشعار شریعت کی نظر میں مستحسن ہیں (بیہقی ج ۵ صـ۶۸)

علامہ خازنؒ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں عن ابن عباس قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعل یتکلم بکلام فقال ان من البیان لسحراً وان من الشعر لحِكْمَةً (ابوداؤد) (تفسیر خازن ج ۳ صـ۱۷۳) یعنی ایک بدو کے کلام پر آپ نے فرمایا کہ بعض بیان جادو اور بعض شعر حکمت ہیں

اشعار کے متعلق ایک فیصلہ امام بخاریؒ کی الادب المفرد میں ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ الشعر حسن کحسن الکلام ومنہ قبیح یعنی جس طرح نثری عبارت میں اچھے برے مضامین ہوا کرتے ہیں، اسی طرح شعروں میں بھی اچھے برے معلومات و مواد ہوتے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ فرمایا الشعر بمنزلۃ الکلام حسنہ کحسن الکلام وقبیحہ کقبیح الکلام (الادب المفرد صـ۱۲۵ مطبع خلیلی آرہ سنہ ۱۳۰۶ھ) یعنی اشعار کو عام گفتگو کی طرح سمجھو، جیسے بعض کلام اچھے ہوتے ہیں ویسے ہی بعض اشعار بھی اچھے ہوتے ہیں، اور جس طرح بعض کلام برے ہوتے ہیں اسی طرح بعض اشعار بھی قبیح و ناپسندیدہ ہوتے ہیں،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں الشعر منہ حسن ومنہ قبیح خذ بالحسن ودع بالقبیح (الادب المفرد صـ۱۲۷) یعنی اشعار اچھے بُرے ہر قسم کے ہوتے ہیں تو تم کو اچھے اشعار کا انتخاب کر لینا چاہئے اور ناپسندیدہ و قبیح اشعار کو ترک کر دینا چاہئے،

اشعار کی سادگی و پاکیزگی حضرت حسانؓ بن ثابت وہ شاعر اسلام ہیں جو حقائقِ دین و معارفِ اسلام وحبِّ رسول وغیرہ پر سادہ و پرشکوہ اشعار کہتے تھے، ان کے کلام میں اسلام سے قبل والا عاشقانہ

رنگ نہ پاکر کسی نے ان سے کہا ھوم شعرک فی الاسلام یعنی تمھارے اشعار میں جو رنگ اسلام سے قبل تھا اب وہ باقی نہ رہا، اب تمھارے اشعار بوڑھے معلوم ہوتے ہیں، اس کا انھوں نے خوب جواب دیا کہ اسلام کذب بیانی سے مانع ہے اور اشعار کی زینت مبالغہ آرائی اور کذب بیانی ہی ہے، یعنی رائی کو پربت بنا کر دکھانا، قطرہ کو سمندر کر دکھانا، شعروں میں لطف کی چیز سمجھی جاتی ہے، اور یہ چیزیں اسلام میں منع ہیں، شاعر اسلام حضرت حسانؓ کا یہ مقولہ ان الاسلام یمنع من الکذب وان الشعر یزینہ الکذب، شعراء کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے

اشعار کو کذب و مبالغہ سے پاک ہونا چاہئے

اشعار میں کذب و غلو اور غصہ کے وقت ہجو ناجائز ہے، اس طرح شعر گوئی میں ایسا انہماک و اشتغال بھی ناجائز ہے جس سے ذکر الٰہی، تلاوت قرآن کریم اور فرائض کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی ہونے لگے، امام بیہقیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ کی یہی رائے ہے، اور انھوں نے اپنی کتابوں میں مندرجہ ذیل باب بھی قائم کیا ہے باب ما یکرہ ان یکون الغالب علی الانسان الشعر حتی یصدہ عن ذکر اللہ والعلم والقرآن (بخاری ج ۲ ص ۹۰۹ ایضاً بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۴، ایضاً الادب المفرد ص ۱۲۹ مطبع خلیلی آرہ)

لیکن امام بیہقیؒ اور امام بخاریؒ کی یہ بات کچھ شعر گوئی کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہو بلکہ جس مباح عمل اور مشروع امر میں انہماک و اشتغال کسی دوسرے فرض کے ترک و ضیاع کا باعث ہو تو وہ بھی ناجائز ہوگا مثلاً مطالعہ کتاب یا تصنیف و تالیف یا تلاوت قرآن پاک یا مشق قرأۃ میں اگر اس قدر توغل ہو کہ اس کی وجہ سے نماز کا وقت نکل جائے یا نماز وغیرہ سے غفلت و بے پرواہی پیدا ہو جایا کرے تو یہ امور باوجود جائز ہونے کے ناجائز ہو جائیں گے (ملاحظہ ہو بیہقی ج ۱۰ ص ۲۱۹)

مدحیہ اشعار میں مبالغہ کی ممانعت

اشعار میں مبالغہ و اطناب بھی عموماً شاعروں کی عادت ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے، بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک شخص کی بے حد تعریف کر رہا ہے تو فرمایا تو نے اسے خراب و ہلاک کر دیا، پھر فرمایا کہ اگر تعریف ضروری ہو تو بھی حد سے زیادہ مبالغہ نہیں کرنا چاہئے، (بخاری ج ۲ کتاب الشہادۃ باب ما یکرہ من الاطناب من الکلام)

ہجو میں مبالغہ اور غلو ناپسندیدہ ہے

ہجو میں مبالغہ اور غلو کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے، فرمایا کہ دو قسم کے آدمی مجرم ہیں، ایک وہ شاعر جو پورے قبیلہ کی ہجو کر رہا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اپنے باپ سے اپنی نسبت کو الگ کر رہا ہے (الادب المفرد، مطبوعہ آرہ) ص ۱۳۶

آج کل معاملہ برعکس ہے، مدح ہوتی ہے تو افراط اور غلو کا پہلو نمایاں، اور ہجو و مذمت کی نوبت آتی ہے تو تفریط کا پہلو غالب رہتا ہے، عام طور سے اخلاقی، اصلاحی، انقلابی اشعار بہت کم نظر آسکتے ہیں، ایسی حالت میں ہمیں اپنے ذوق کے مطابق اشعار کا اچھا انتخاب خود کر لینا چاہئے، فرمان نبوت میں اس کی طرف رہنمائی موجود ہے،

پیشہ ور ہنسانے والے شاعروں کا انجام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الرجل یتکلم بالکلمۃ یضحک بھا جلساءہ یھوی بھا من ابعد من الثریا یعنی محض ہنسانے کی خاطر شعر و شاعری کرنے والے یا گپ بازی کرنے والے ثریا سے بھی زیادہ بلندی سے پستی کی طرف پھینک دیئے جاتے ہیں، (مسند احمد ج ۲ ص ۴۰۲)

آنحضرتؐ کا اشعار سننا اور پسند فرمانا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشعار کو سنتے اور پسند فرماتے تھے اور اس سلسلہ میں اپنے ذوق لطیف کا اظہار بھی فرماتے، (استیعاب لابن عبد البر ج ۱ ص ۱۳۳)

استیعاب میں عہد نبوی کے شعراء کا مفصل تذکرہ ہے، حسان بن ثابتؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ اور کعب بن مالکؓ دربار نبوت کے شعرائے محسنین (اچھے شاعروں) میں شمار کئے جاتے تھے (بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۱)

ذیل میں اشعار کے سلسلہ میں چند روایات نقل کی جاتی ہیں جن سے اچھے اشعار کے بارہ میں اسلام کا موقف واضح ہو جائے گا،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اکثر فرماتے اما فعلت ابیاتک کہ تمہارے اشعار کیا ہوئے ؟ میں کہتی ای ابیاتی ترید یا رسول اللہ فانہا کثیرۃ کہ حضور! میرے بہت سے اشعار ہیں آپ کس قسم کا شعر سننا چاہتے ہیں فیقول فی الشکر آپ فرماتے اپنے وہ اشعار سناؤ جو خدائے تعالیٰ کی شکر گزاری میں ہیں، پس میں آپ کو سناتی (معجم طبرانی بحوالہ استیعاب تذکرہ عائشہؓ)

امام بخاریؒ ادب المفرد میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کعب بن مالکؓ کے اشعار وقصائد کے علاوہ دوسرے شعراء کے اشعار بھی مجھکو حفظ تھے (الادب المفرد ۱۲۷)

اشعار سننے کی فرمائش عرب میں عورتیں بھی عموماً شاعرہ ہوتی تھیں، خنساء ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمائش کرکے اشعار سنتے اور ان کے اشعار کو بہت پسند فرماتے تھے، وہ سناتی جاتی تھیں اور آپؐ فرماتے ھیہ یاخنساء یعنی اے خنساء! اور سناؤ (استیعاب کتاب النساء ص۷۲۳)

اشعار کی تعریف سبعہ معلقہ کے مشہور شاعر لبید بن ربیعہ کے ان اشعار کو آنحضرتؐ خود بھی پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ یہ کتنے سچے اور اچھے اشعار ہیں

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل — وکل نعیم لا محالۃ زائل

وکل امریٔ یوماً سیعلم سعیہ — اذا انکشفت عند الالٰہ المحاصل

(صحیح بخاری ج۱، باب ایام الجاہلیۃ ص۵۴۲، استیعاب ج۲ ص۲۲۵)

(ترجمہ) اللہ کے سوا ہر چیز معدوم ہونے والی اور تمام نعمتیں زوال پذیر ہونے والی ہیں۔ اور قیامت میں جب ہر شخص کو عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو اسے اپنی کوشش کی قدر وقیمت معلوم ہو جائے گی۔

داد وتحسین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے شعراء کے اشعار کی تحسین بھی فرمائی ہے، ایک مرتبہ عبد اللہ بن رواحہؓ کے اشعار سن کر فرمایا کہ یہ خوب کہتے ہیں، پھر اس کے بعد ان کے بعض شعروں کو پڑھتے رہے، (بیہقی ج۱ ص۲۳۹)

انی تفرست فیک الخیر اعرفہ — واللہ یعلم انی ما خاننی البصر

انت النبی ومن یحرم شفاعتہ — یوم الحساب لقد ازری بہ القدر

(استیعاب ج۱ ص۳۵)

(ترجمہ) میں اپنی فراست سے آپ کی ذات میں بھلائی کو تاڑ گیا، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میری نگاہ نے غلطی نہیں کی، آپ وہ نبی اکرمؐ ہیں جن کی شفاعت سے قیامت کے دن کسی کا محروم رہنا اس کے شومئی قسمت کی دلیل ہے،

حضورؐ کا ایک نشست میں سو سو اشعار سننا ایک صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضورؐ کے پیچھے تھا تو آپ نے امیہ بن ابی صلت کے اشعار سنانے کی مجھ سے فرمائش کی، چنانچہ میں سنانے لگا تو آپ کا یہ حال تھا کہ ہر شعر سننے کے بعد فرماتے کہ اور سناؤ یہاں تک کہ میں نے سو اشعار سنائے۔ (مسند احمد ج۴ ص۳۹۰)

امام بخاریؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے حضورؐ کی مسلسل فرمائش پر سو سو شعر سنائے، (الادب المفرد ص۱۱۱)

ان روایتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوقِ لطیف کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ آپ اچھے اشعار سننے کے لئے مشتاق رہتے تھے، نیز صحابہ کرام اچھے اشعار کو نوک زبان رکھتے تھے،

مسجد میں اشعار سننے سنانے کی اجازت مسجد میں بھی اشعار سنانے کی اجازت تھی، چنانچہ

حضرت حسان بن ثابت رضؓ اپنے اشعار اکثر مسجد ہی میں حضورؐ کو سنایا کرتے تھے (فتح الباری ج ۲ ص ۲۷)

اچھے اشعار سننا اور حاضرین کو بھی سُننے کی دعوت دینا

کعب بن زہیرؓ نے جب اپنی معذرت اور نعت نبوی پر لمبا قصیدہ بانت سعاد سنایا تو حضورؐ نے اسے بڑی خوشی سے سُنا (زادالمعاد ج ۱ ص ۵۵۹) اور دوسرے حاضرین کو بھی شریک مجلس ہونے کی دعوت دی، چنانچہ امام بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ واشار بکمہ الی الخلق لیا توافلیسمعوا منہ یعنی سب کو اثنائے شعرخوانی میں حضورؐ نے اشارہ سے بلالیا تاکہ سب لوگ آکر سنیں اور لطف اندوز ہوں، (بیہقی ج ۱ ص ۲۴۴)

حضرت عباسؓ کے مدحیہ اشعار

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے فرمایا یارسول اللہ إنی ارید أن امتد حلک، یعنی اے اللہ کے نبی میں آپ کی مدح میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو آپ نے فرمایا قل لا یفضض اللہ فاک یعنی اللہ تمہارا منہ تر وتازہ رکھے، چنانچہ انھوں نے ایک طویل مدحیہ نظم کہی جس کا آخری شعر ہے:

فنحن فی ذالک الضیاء وفی النور　　سبیل الرشاد نخترق

(زادالمعاد ج ۱ ص ۳۶۶)

(ترجمہ) ہم لوگ آپ کے ضیاء نبوت اور آفتاب ہدایت کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں،

فتح مکہ کے موقع پر مبارکبادی کو اشعار

ضرار بن خطاب قریش کے بڑے زبردست شاعر تھے، فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے اور آپ کی خدمت میں یہ مبارکباد دیتے ہوئے حاضر ہوئے جیں قریش کی درخواست بھی گذاری تھی، یہ قصیدہ بھی طویل ہے اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یا نبی الھدی الیک لجاء　　حیُّ قریش وانت خیر لجاء

(استیعاب ج ۱ ص ۳۲۶)

(ترجمہ) اے ہادیٔ اکرمؐ آپ ہی کی ذات قبیلۂ قریش کی پناہ ہے اور آپکی ذات سب سے بہتر اور عمدہ پناہ ہے

قبول اسلام کی خوشی میں اشعار کا نذرانہ

اسی طرح ابوسفیانؓ نے فتح مکہ کے دن جب اسلام قبول کیا تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے رشتۂ تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے یہ اشعار سنائے،

اصد وانائی جاھدا عن محمد　　وادعی وان لم انتسب عن محمد

یعنی میں جان بوجھ کر محمدؐ سے اعراض کرتا رہا جنکی طرف مجھکو چار وناچار منسوب ہونا ہے،

لعمرک انی یوم احمل رایۃ　　لتغلب خیل اللات خیل محمد

ہاں جب میں آپکے بالمقابل سرداری کا جھنڈا اٹھاتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ محمدؐ کی انصار لات کی انصار پر غلبہ پاتے تھے۔

ھدانی ھاد غیر نفسی ودلنی　　علی اللہ من طردتہ کل مطرد

آج مجھے اس ذات نے اللہ کی طرف ہدایت دی جسکو میں نے ہر طریقہ سے ہر موقع پر دنیا سے دھکیل دینا چاہا تھا،
(استیعاب ج ۲ ص ۴۹۰)

بعض دوسرے شاعروں نے بھی اسلام لانے کے موقع پر اشعار ہی کا نذرانہ پیش کیا ہے، چنانچہ ایک صحابی مالک بن عوفؓ نے جو اچھے شاعر تھے اپنے اسلام لانے کے موقع پر حضورؐ کے سامنے اپنے چند اشعار سُنائے، ان میں ایک شعر یہ تھا

ما ان رایت ولا سمعت بماری　　فی الناس کلھم کمثل محمد

یعنی جہاں تک میں نے نظر دوڑایا اور دیکھا اور سنا، دنیا میں محمدؐ کی مثال نظر نہیں آتی۔ کہ کہ نہ کہ کسی نے اردو میں کیا خوب ترجمہ کیا ہے

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے　　کوئی دین دین محمدؐ سا نہ پایا ہم نے

قبول اسلام پر قصیدہ کا نذرانہ

اسی طرح نابغہ جعدی بڑے شاعر تھے جب یہ مسلمان ہوئے تو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا تازہ اور طویل قصیدہ سنایا جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اتیت رسول اللہ انجاء بالھدیٰ — ویتلو کتاباً کالمجرۃ نیرا

اقیم علی التقوی وارضی بفعلھا — وکنت من النار المخوفۃ احذرا

یعنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس لئے حاضر ہوا کہ آپ نور ہدایت اور روشن کتاب لے کر آئے ہیں جو آسمان کی سفید دھاری کی طرح ممتاز ہے میں تقویٰ پر راضی ہوں اور اس پر مداومت کروں گا اور جہنم کی آگ سے پُر حذر رہوں گا،

علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ یہ قصیدہ تقریباً دو سو اشعار پر مشتمل ہے جسے حضورؐ نے سنا اور سن کر فرمایا اجدت لا یفضض اللہ فاک یعنی تم نے خوب کہا، اللہ تعالیٰ تمھارے منہ کو تر و تازہ رکھے، (استیعاب ج ۱ ص ۳۲۱ و ۳۲۲) اس واقعہ سے بھی اچھے اشعار کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بیماروں کی شاعری جب مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ طیبہ پہونچے تو وہاں کی آب و ہوا اکثر اصحاب کو ناموافق ہوئی، حضرت بلالؓ بیمار ہو گئے اور حضرت ابو بکرؓ بھی بیمار ہوئے، حضرت عائشہؓ عیادت کو حاضر ہوئیں تو سب نے بیمار پرسی کے جواب میں اپنے اشعار سنائے، حضرت بلالؓ نے بڑی تمنا سے وطن مالوف کی یاد میں یہ شعر سُنایا:

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ — بواد وحولی اذخر وجلیل

(استیعاب کنز العمال ج)

(ترجمہ) کاش مجھو ایک رات اس وادی میں گذارنا نصیب ہوتا جسکے ارد گرد اذخر اور جلیل (دو قسم کی گھاسیں) ہیں

ان ہی حالات میں حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تو مدینہ کو ہم سب کے لئے محبوب بنا دے اور خوشگوار کر دے (سنن اربعہ)

اشعار کے ذریعہ شکایات کا اظہار آپ کے سامنے شکایتیں بھی موزوں شعر کی صورت میں پیش کی جاتی تھیں،

علامہ سیوطی خصائص میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے باپ میرے مال میں تصرف کرنا چاہتے ہیں اور لے لینا چاہتے ہیں، آپ نے ان کے والد کو بلا کر فرمایا کہ آپ ان کی شکایت کے جواب میں کیا کہنا چاہتے ہیں، انھوں نے لڑکے کو خطاب کر کے آپ کے سامنے یہ اشعار کہے:

کانی انا المطروق دونک بالذی — طرقت بہ دونی فعینی تمھل

یعنی ہر وہ مصیبت جو تجھ پر آتی ہے گویا مجھ ہی پر آتی ہے اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں

فلما بلغت السن والغایۃ التی — الیک مدی ماکنت فیک اومل

لیکن جب اپنے اس سن کو پہونچا جو میری امیدوں کی جگہ اور میری تمناؤں کا مرکز ہے۔

جعلت جزائی غلظۃ وفظاظۃ — کانک انت المنعم المتفضل

تو تو نے مجھکو سخت کلامی و درشت مزاجی دکھائی، کیا میرے احسانات کا یہی صلہ ہے گویا تیرا ہی مجھپر احسان ہے

فلیتک اذلم ترع حق ابوتی — کما یفعل الجار المجاور تفعل

پس اگر تو میرے پدری حقوق کا لحاظ نہیں کرتا تو کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے ساتھ کرتا ہے۔

علامہ سیوطیؒ بروایت بیہقی نقل کرتے ہیں فبکیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخذ بتلبیب ابنہ وقال انت ومالک لابیک (حضورؐ یہ پُر درد اشعار سنکر رونے لگے اور بیٹے کی گردن پکڑ کر فرمایا کہ تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے) (خصائص ج ۲ ص ۱۰۲)

اشعار کے ذریعہ ہجو و ملامت کا جواب ہجو و اعتراض کا جواب بھی شعروں کے ذریعہ دیا جاتا تھا، مثلاً حضرت

حسان بن ثابتؓ اکثر کفار کے ہجو واعتراض کا جواب دیتے اور سرور کائناتؐ کی مدافعت کرتے،

ھجوت محمداً فاجبت عنه　　وعند الله فی ذاك الجزاء

میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمہاری بدگوئیوں کا جواب دیتا ہوں اور اللہ پاک سے اجر کی امید رکھتا ہوں۔

فان ابی و والدتی وعرضی　　لعرض محمد منکم وقاء

یعنی میری عزت اور میرے ماں باپ سب سرور کائناتؐ کی عزت کیلئے نثار ہیں ؎ ؎ ؎ ؎ ؎
(بیہقی ج باب شہادۃ الشعراء ص ۲۳۱)

مجلس نبویؐ میں اشعار خوانی

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام جب حضورؐ کی مجلس میں شعر گوئی و شعر خوانی کرتے تو آپؐ بعض اشعار کی لطافت وظرافت پر مسکرا دیتے اور تبسم فرماتے (بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۱ مسند احمد ج ۵ ص ۳۰۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں باہم شعر خوانی کرتے جسے خود آپ بھی سنتے تھے،

صحابہ کرام سے اشعار سنانے کی فرمائش

علامہ ابن عبد البرؒ حضرت ابو الدرداءؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی نے ان سے کہا ما لك لا تقول الشعر وكل لبيب من الانصار قال الشعر (آپ کیوں نہیں شعر کہتے حالانکہ انصار کے تمام ذی ہوش لوگوں نے اشعار کہا ہے) فرمایا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں تو سنو!

یرید المرء ان یوتی مناه　　ویابی الله الا ما اراد؎

یقول المرء فائدتی ومالی　　وتقوی الله افضل ما استفاد

یعنی آدمی چاہتا ہے کہ اس کی تمام آرزوئیں حاصل ہوں، مگر ہوتا ہے وہی جو اللہ چاہتا ہے، آدمی کہتا رہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے یہ میرا نفع ہے مگر اللہ کا تقویٰ ہی اصلی دولت ہے (صفوۃ الصفوۃ ص ۲۶۳)

مجلس مشاعرہ کا انعقاد

امام شعبیؒ سے روایت ہے کہ کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہؓ کے نام حضرت

عمر فاروقؓ نے خط لکھا کہ تمہارے ہاں جو شعراء ہیں ان کو طلب کر کے سب جاہلیت اور اسلام کے زمانہ کے اشعار سنو، اور اسکی روداد ہمیں بھی لکھ بھیجو، چنانچہ مغیرہ بن شعبہ نے مجلس مشاعرہ آراستہ کی! انھوں نے سب سے پہلے لبید بن ربیعہ سے کہا انشدنی ما قلت من الشعر فی الجاهلية و الاسلام یعنی زمانہ جاہلیت اور اسلام میں تم نے جو اشعار کہے ہوں ان کو سناؤ، انھوں نے جواب دیا سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی نعمت پانے کے بعد میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا، اللہ نے مجھے یہ نعم البدل عطا کیا۔ اب مجھے اشعار میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی، پھر اغلب عجلی سے کہا کہ تم اپنے شعر مجھے سناؤ، اس نے کہا أرجزاً تريد ام قصيداً لقد سألت هيناً موجوداً اور لوگوں سے بھی اسی طرح سوال وجواب ہوئے۔ جب حضرت مغیرہؓ نے یہ ساری باتیں لکھ کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیجیں تو انھوں نے حکم دیا کہ اغلب کے وظیفہ میں سے پانچسو ماہوار گھٹا کر لبید کے وظیفہ میں پانچسو ماہوار اضافہ کر دو۔ آخر اغلب حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور اپنا وظیفہ بحال کرا لائے، اور لبید کا بھی پانچسو ماہوار وظیفہ انھیں تا عمر بیت المال سے ملتا رہا۔ (صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۳۱۰)

ادب، زبان، شعر وخطابت کا مقابلہ خود حضورؐ نے بھی کرایا ہے (زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵۲)

حضرت عمرؓ کو لبید کا ادبی ذوق بہت پسند آیا جس کی وجہ سے وہ قرآن کی ادبی فصاحت وبلاغت اور معنوی لطافت کے سامنے اشعار عرب کو بے قیمت اور بے لذت خیال کرتے تھے، ان کی یہ ادا حضرت عمرؓ جیسے قدر شناس خلیفہ کو بھا گئی۔

قطع مسافت کیلئے اشعار خوانی

بیہقی میں حضرت عمر فاروقؓ کے اس سفر حج کا واقعہ موجود ہے جس میں انکے ساتھ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ بھی تھے، جب ان دونوں نے خوات شاعر سے ضرار کے اشعار سنانے کے لئے کہا تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم خود اپنے اشعار سناؤ۔ چنانچہ وہ خود اپنے ہی اشعار صبح تک ان حضرات کو سناتے رہے۔
(بیہقی ج ۵ ص ۶۵)

قطع سفر کیلئے اشعار خوانی

مطرف نامی ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں صحابی رسول حضرت عمران بن حصینؓ کے ساتھ ایک سفر میں کوفہ سے بصرہ تک رہا، اس سفر میں ہر منزل اور فرودگاہ پر ہم قیام کرتے، اور حضرت عمرانؓ تقاضہ کر کے مجھ سے اشعار عرب سنتے۔ (الادب المفرد ص۱۲۶)

حضرت عمرؓ نے بعض اچھے شعروں کا مصداق خود حضورؐ کو ٹھہرایا

حضرت عمرؓ جب زہیر بن ابی سلمی کا یہ شعر پڑھتے جو اس نے ہرم بن سنان کے متعلق کہا ہے:

ولو کنت من شیٔ سوی بشر کنت المضئ للیلۃ البدر

یعنی اے ممدوح اگر تم انسان کے سوا کچھ اور ہو سکتے تو میں کہتا کہ ماہ کامل یعنی بدر میں روشنی پیدا کرنے والے تمہیں ہو۔

تو حاضرین مجلس سے کہتے کہ اس شعر کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ (مسند احمد ج۳ ص۹۱)

شعراء کو انعام

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض شعراء کو خوشی میں انعام بھی مرحمت فرمایا ہے۔ (بیہقی عاشر ص۲۴۱)

شاعروں اور زبان دانوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے مال کے ذریعہ اپنی آبرو بچالو لوگوں نے پوچھا کہ مال دے کر آبرو بچانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا تعطون الشاعر ومن تخافون لسانہ (یعنی جس کی زبان سے ذلیل ہو جانے کا خطرہ ہو جیسے شاعر وغیرہ تو اُن کو مال دے کر آبرو بچالو) (مسند احمد ج اول ص۲۴۷)

حضرت عمران بن حصینؓ کے پاس ایک شاعر آیا، آپؓ نے رخصت کے وقت اس کو کوئی عطیہ دیا، کسی مصاحب نے دریافت کیا کہ شاعر کو کس قسم کا انعام دیا گیا ہے؟ فرمایا کہ عزت وآبرو کی حفاظت کس کو نہیں عزیز ہے۔ (ادب المفرد ص۵۲)

حضرت عمر فاروقؓ ایک مرتبہ باہر نکلے تو قبیلہ غطفان کا وفد موجود تھا، اپنے چند اشعار پڑھ کر پوچھا کہ یہ کس کے شعر ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ نابغہ کے، فرمایا ھذا اشعر شعراء کم یعنی یہ تمہارے سب شاعروں میں بڑے شاعر ہیں۔ (مرأۃ الجنان ج ص۲۱۷)

سرمایہ دار کے خلاف شاعر کی شکایت پر توجہ

حضرت عمرؓ کے پاس زبرقان بن بدر نے حطیہ شاعر کے ہجو کی شکایت کی تحقیق سے حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ حطیہ نے واقعی ہجو کی ہے تو اس کو بلا کر جیل خانہ میں ڈال دیا، وہاں سے حطیہ نے لکھا کہ میں تو قید میں ہوں میرے بچے بھوکوں مر رہے ہیں، آخر حضرت عمرؓ نے اس کو جیل خانہ سے نکالا اور پوچھا کہ تو کیوں کسی مسلمان کی ہجو کرتا ہے، اس نے کہا کہ شاعری ہی میری کمائی، اور زبرقان میری قوم میں دولت مند ہے اس کو میری کمزوری اور میرے کثیر العیال ہونے کی خبر ہے، لیکن کبھی اس نے خود سے خیال نہیں کیا، اور جب میں سوال پر مجبور ہوا تو اس نے سوال کے باوجود بھی محروم رکھا، وہ خود تو مزے اُڑاتا اور اونٹ کی طرح ڈکاریں لیتا ہے اور میں اپنے بال بچوں سمیت روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کا محتاج تھا۔ یہ سنکر حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، آپ نے اس کے بال بچوں کی تعداد معلوم کر کے سب کا خرچ سال بھر کے لئے دیدیا اور فرمایا کہ ختم ہونے کے بعد پھر میرے پاس آنا۔ (منتخب کنز العمال ج ص۳۰۱)

شاعر کے لئے سفارش وعطیہ

حضرت عمرؓ نے حطیہ شاعر کو اس کی بدگمانی اور ہجو گوئی پر قید کر دیا تھا، کیونکہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے ان اعظم الناس جرمًا شاعر یھجو القبیلۃ من اسرھا (الادب المفرد ص۱۳۷) یعنی وہ شاعر بڑا مجرم ہے جو پورے خاندان کی ہجو کرتا ہے۔

بہرحال جب ہجو گوئی کے جرم میں حطیہ قید ہوا تو حطیہ نے حضرت عمرؓ کے پاس چند شعروں کے ذریعہ رہائی کی درخواست کی کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے ایک نگہبان کو آپ نے قید میں ڈال رکھا ہے

القیت کاسبھم فی قعر مظلمۃ — فارحم ھداک ملیک الناس یا عمر

یعنی آپ نے بچوں کے لئے کمانے والے کو تاریک جیل خانہ میں ڈال رکھا ہے اے عمر تو رحم کر، خدا تیری ہدایت کرے،

حضرت عمرؓ نے لوگوں کی بدگوئی نہ کرنے کا عہد لیکر اس کو آزاد کردیا، اس کے بعد اس نے کہا کہ اشعار ہی سے میری کمائی ہوتی تھی، جسے آپ نے روک دیا، اس لئے علقمہ بن علاثہ کے پاس آپ ایک سفارشی خط لکھ دیجئے، انھوں نے بعض صحابہ سے مشورہ کے بعد علقمہ کو خط لکھ دیا، مگر جب خط لیکر وہاں پہونچا تو لوگ علقمہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر واپس آرہے تھے حطیہ نے اس کے لڑکے کو حضرت عمرؓ کا خط دیا، لڑکے نے پوچھا کہ اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو تم کو ان سے ملنے کی کیا امید تھی اس نے کہا کہ سو ایسی اونٹنیاں جن کے پیچھے ان کی اولاد بھی ہوتی، لڑکے نے یہ سنتے ہی سو بچوں والی اونٹنیاں اس کے حوالہ کردی، (مرآۃ الجنان ج۱ ص۳۹۳)

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے ایسے مظاہرے پھر کہاں نصیب ہوں گے۔

امام زین العابدین کا عطیہ فرزدق شاعر کے لئے

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حج میں ہشام بن عبد الملک طواف کے بعد حجر اسود کا بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن کثرت اژدہام کے سبب نہ دے سکا تو ایک اونچے مقام پر امرائے شام کے ساتھ جاکر الگ بیٹھ گیا، یکایک امام زین العابدین علی بن حسین بن علی بن ابی طالب آئے جو بہت خوبصورت تھے، اور جن کے بدن سے خوشبو نکلتی تھی، انھوں نے بڑے سکون و اطمینان سے طواف کیا اور جب حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھے تو لوگوں نے انکی عظمت واحترام اور تقدس کی بنا پر جگہ خالی کردی، یہ منظر رؤسائے شام کے سامنے ہوا، ایک سردار نے کہا کہ یہ کون جلیل القدر اور عظیم المرتبت ذات ہے، ہشام نے کہا لا اعرفہ (مجھے خبر نہیں، ہوگا کوئی) فرزدق وہاں موجود تھا اس سے نہ رہا گیا اور فوراً بول پڑا کہ یہ وہ شخص ہے جس کو ساری خدائی پہچان رہی ہے، یہ کہہ کر اس نے امام زین العابدین کی شان میں ۲۵ شعروں کا ایک قصیدہ پڑھا

جس کے چند اشعار یہ ہیں:

ھذا الذی یعرف البطحاء وطأتہ — والبیت یعرفہ والحل والحرم

ھذا ابن خیر عباد اللہ کلھم — ھذا النقی التقی الطاھر العلم

یعنی یہ وہ شخص ہے جس کو ساری خدائی پہچانتی ہے اور بیت اللہ، اہل حرم اور ارض پاک بطحا کے لوگ جس کا صدق دل سے احترام کرتے ہیں۔

ہشام ان کی یہ تعریف سنکر سخت خفا ہوا اور فرزدق کو جیل خانہ بھجوا دیا، امام زین العابدینؓ کو خبر پہونچی تو انھوں نے بارہ ہزار درہم فرزدق کو انعام دیا، (مرآۃ الجنان ج اول ص۲۳۹)

جریر شاعر کی قدر افزائی

شاعر اسلام جریر سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ بھی خاص انسیت رکھتے تھے، یافعیؒ کے الفاظ ہیں کان عمر بن عبد العزیز لا یاذن لاحد من الشعراء أن ید خلوا علیہ الا الجریر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ شاعروں میں صرف جریر شاعر کو اپنے یہاں حاضری کی اجازت دیتے تھے۔

جریر کی قدر و منزلت

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شعرائے اسلام میں جریر ایک نامور شاعر گزرا ہے، ایک بار عبد الملک بن مروان کے دربار میں اس نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں صرف ایک شعر میں دودھ سے سیرابی کی تمنا کا اظہار تھا، عبد الملک گاؤتکیہ لگائے بیٹھا تھا جیسے شعر کو جب پڑھنے لگا

الستم خیر من رکب المطایا — وأندی العالمین بطون راح

یعنی کیا جتنے لوگ سواریوں پر سوار ہوتے ہیں انہیں تم سب سے بہتر نہیں ہو اور کیا سخاوت دنیا میں کے اعتبار سے پوری دنیا کے سب سے بڑے سخی تم لوگ نہیں ہو،

تو عبد الملک اٹھ بیٹھا اور کہا کہ جو کلب کی سو دودھ والی اونٹنیاں تمکو کافی نہ ہونگی کہا کہ بہت کافی ہونگی

پھر جریر نے کہا کہ امیر المومنین نحن مشائخ فلو امرت لی بالرعاء کہ ہم مشائخ ہیں آپ انکو چرواہا بھی عنایت فرمائیں تو آٹھ چرواہے مل گئے، عبد الملک کے سامنے سونے کی بڑی بڑی پیالیاں تھیں، انکو بھی دودھ کا برتن بنانے کے لئے عنایت فرمادیا۔ (مرآۃ الجنان ج ا ص۲۳۶) (باقی)

عورت اور پردہ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس خاکسار کے پاس دہلی کے بیت الحکمۃ کی طرف سے ایک سمینار کے لئے جب دعوت نامہ پہونچا تو اس میں فرمائش تھی کہ میرا مقالہ "عورت اور پردہ" پر ہو، سمجھ میں نہیں آیا کہ اس چبائے ہوئے نوالے کو کس طرح چبایا جائے، اس پُرانی بحث میں کونسی ایسی بات کہی جاسکتی ہے جو اب تک نہیں کہی جاسکی، مقالہ لکھنا تھا اس لئے اس خیال سے لکھنے بیٹھ گیا کہ یہ پرانی بات شاید کسی نئے انداز میں بیان ہوجائے تو پہلے پردہ سے متعلق ذرا دل تھام کر احکامِ الٰہی سماعت فرمائیں، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ سے فرماتے ہیں:

"مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی عصمت کی حفاظت رکھیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو اس میں سے کھلا رہتا ہے، اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ان لوگوں کے سامنے جیسے شوہر یا اپنے شوہر کے باپ، اپنے بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں، اپنی عورتیں اپنے غلام و مرد خدمت گاروں جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا ایسے لڑکوں جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہوئے ہیں، وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہوجائے،" (النور ۳۰)

پھر سورۃ الاحزاب میں ہے:

"اے نبی اپنی بیویوں بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے" (الاحزاب: ۸۰)

ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد عورتوں کے لئے حجاب لازمی ہوگیا، مگر وہ باہر نکل سکتی تھیں جس کے لئے وہ نقاب یا جلباب یا برقع استعمال کرتی رہیں،

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ باہر نکلنے میں عورتوں کو اضطراراً یا ناگزیر حالات و ضروریات میں ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصہ کھولنا پڑے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ چہرہ اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کا حصہ ستر میں داخل نہیں ہے. عہدِ رسالت میں عورتیں نقاب یا جلباب کے ساتھ برابر نکلتی رہیں، بلکہ غزوات میں بھی شریک ہوئیں، جنگ احد میں حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں، اسی جنگ احد میں ام سلیطؓ اور ام عمارہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں ہر طرف رہ کر آپ کی حفاظت کے لئے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں، ام عمارہؓ تو دشمنوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہوئیں، اسی جنگ میں ربیع بنت معوذؓ خواتین کی ایک جماعت کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھیں، اور مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینہ لے گئی تھیں، جنگ حنین میں ام سلیمؓ ایک خنجر ہاتھ میں لئے پھر رہی تھیں کہ اگر کوئی مشرک ان کے قریب آیا تو وہ اس کا پیٹ پھاڑ دیں گی، غزوۂ خندق میں حضرت زبیرؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ نے بڑی بہادری دکھائی، بنو قریظہ کا ایک یہودی وہاں پہونچ گیا جہاں عورتیں تھیں، حضرت صفیہؓ نے اپنے خیمہ کے ایک ستون سے اس کو ہلاک کیا، ام عطیہؓ رسول اللہ صلعم کی سات لڑائیوں میں آپ کے ساتھ رہیں، کیمپ کی حفاظت کرنا، سپاہیوں کے لئے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا. حضرت عائشہؓ تو جنگ جمل کی سربراہی خود ہی کر رہی تھیں.

ان مثالوں سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی ضرورت اور مصیبت کے وقت عورتیں گھر سے باہر نکل کر میدانِ جنگ میں بھی کام کر سکتی ہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ ضرورت مصیبت اور لڑائی ہو یا نہ ہو، عورتوں کو محکمۂ جنگ میں کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور دیدی جائے، کیونکہ عہد رسالت میں خواتین میدان جنگ میں کام کرتی رہیں یا ان کو کمانڈر ان چیف اس لئے مقرر کیا جائے کہ حضرت عائشہؓ سپہ سالاری کا فرض انجام دے چکی ہیں، حضرت عائشہؓ یا اور صحابیات جنگ میں خدمات انجام دینے کے بعد اپنے گھروں ہی کی طرف پلٹ آئیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق عورت کی اصلی راجدھانی اس کے شوہر کا گھر ہے، جہاں بخاری شریف کی حدیث کے مطابق وہ حکمراں بن کر رہتی ہے اور وہیں اپنی اس حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے،
(بخاری شریف کتاب الاحکام باب قول اللہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم)

وہ گھر کے اندر اس لئے نہیں رہتی ہے کہ مرد اس پر ظلم کر کے اس کو چہار دیواری میں مقید کر دیتا ہے بلکہ وہ نسوانیت کی حیا، شرم، عظمت اور سطوت کا پیکر بن کر گھر کی زینت بنی رہتی ہے، اسی میں اسکی نسوانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک بار حضرت اسماءؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا اے رسول اللہؐ مرد ہم سے بازی لے گئے، رسول اللہؐ نے پوچھا اے اسماء کس طرح؟ عرض کیا مردوں کے لئے نماز جمعہ فرض ہے، وہ اس کا ثواب سمیٹتے ہیں، نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں، جہاد میں جا کر شہید ہوتے ہیں یا غازی، اور عورتیں گھروں میں بیٹھ کر ان تمام ثواب سے محروم ہیں، وہ صرف بچے پالتی ہیں، مردوں کے لئے روٹی پکاتی ہیں اور چولھے جھونکتی رہتی ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسماء تم عورتوں سے کہہ دو جن کی نمائندہ بن کر تم آئی ہو کہ مرد باہر کے اتنے کام کر کے مدارج پاتے ہیں، عورتیں گھر میں رہ کر بچوں کو تربیت دیتی ہیں، مردوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں، گھر کا سکون بہم پہونچاتی ہیں تو درجے میں تم دونوں برابر

ہو، یہ نہیں کہ مرد کو زیادہ درجات ملیں اور تم کو کم۔

گھر کے اندر رہنے کے باوجود کون ایسے تمدنی، معاشرتی اور معاشی حقوق ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں؛ (البقرہ ۲۲۸) سورۂ آل عمران میں ہے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو۔ (آل عمران ۲۰)

اور آج یورپ یا امریکہ کو اپنی صحیح یا غلط قسم کی آزادئ نسواں پر جتنا بھی ناز ہو لیکن مسیحی یورپ کے ابتدائی دور کے ائمہ اور اولیائے کبار میں ترتولیاں اور کرائی سوسٹم کی تعلیم یہ تھی، عورت شیطان کے آنے کا دروازہ، شجر ممنوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، مرد کو غارت کرنے والی، ایک ناگزیر برائی، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے، مگر تقریباً اسی زمانہ میں رسول اللہؐ نے ماں، بیوی، بیٹی کے جو مدارج بلند کئے اس پر آج بھی انسانیت ناز کر سکتی ہے، ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا: تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔ اللہ نے تم پر ماں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے، (نسائی کتاب النکاح) یہ بھی فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہونچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات) خود رسول اللہؐ نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اپنی محبت کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے صحیح معنوں میں نسوانیت کا درجہ بلند ہو گیا ہے۔

مگر ہمارے تجدد پسند حضرات ان مولویانہ مواعظ کو پردہ کی حمایت میں موثر دلائل قرار دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو قرآن حکیم، حدیث شریف، اور اسلامی روایات کی ایسی تاویلیں اور تعبیریں چاہتے ہیں جن سے موجودہ دور میں عورتوں کو وہی آزادی حاصل ہو جو غلط یا صحیح مغربی ممالک میں ہے، اب سے بہت پہلے جسٹس امیر علی کی اسلامی حمیت اور غیرت پر مسلمانوں کو ناز تھا، انھوں نے اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سراسینز لکھ کر مسلمانوں کے بگڑے ہوئے ذہن کو اسلامی بنایا، مگر انھوں نے اپنے زمانہ یعنی ۱۸۹۹ء کا ایک انگریزی رسالہ نائنٹینتھ سنچری میں یہ لکھنے میں تامل نہیں کیا کہ

"یہ لمبا برقع، نقاب اور خار سلجوقیوں کے آخری زمانہ میں رائج ہوا، اور جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند میں رائج ہے خلفاء کے زمانہ میں اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا، بلکہ برعکس اس کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں، ساتویں صدی ہجری کے وسط میں جب خلفا ضعیف ہوئے اور تاتاریوں نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو اس وقت اس پر نزاع ہوئی کہ عورتیں اپنے ہاتھ منھ اور پاؤں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہیں کہ نہیں"

جسٹس امیر علی کی اس پرزور تحریر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی بیوی ایک انگلستانی خاتون تھیں، ان کی موجودگی میں وہ اس پردہ کی حمایت کیسے کر سکتے تھے جس کے احکام قرآن حکیم میں ہیں، مولانا شبلیؒ نے ایک طویل اور مدلل مضمون میں اس کا جواب دیا کہ پردہ کے متعلق تمام دنیا میں مسلمانوں کا جو طریق عمل رہا وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ میں عورتیں بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں، اور بجز کسی خاص حالت کے نامحرموں سے منھ چھپاتی تھیں، یہاں تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا اور مقدم مسئلہ بن گیا تھا، (پردہ اور اسلام، مقالات شبلی جلد اول ص ۱۱)

مگر اب مسلمانوں کی معاشرت کا سب سے بڑا مقدم مسئلہ یہ بنا ہوا ہے کہ پردہ رہے کہ نہ رہے، یہ

آواز بانگ درا بنی ہوئی ہے کہ عورتیں پردہ میں کیوں رہیں، اس کے مقابلہ میں یہ آواز ضرور اٹھتی ہے کہ کیوں نہ رہیں، مگر اب یہ آواز نحیف اور کمزور ہوتی جارہی ہے، مگر دونوں فریقین کے دلائل میں جو فرق ہے وہ قابل غور ہے، بے پردگی کے حامی مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنے دلائل دیتے ہیں جنمیں قیاسات، ظنیات اور احتمالات کو زیادہ دخل ہوتا ہے، پردہ کے حامی جو کچھ کہتے ہیں وہ ماضی کے مشاہدات، تجربات اور یقینیات پر مبنی ہوتا ہے، بے پردگی کے حامی کہتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے جو غیر معمولی تمدنی، معاشرتی، صنعتی اور معاشی انقلابات پیدا ہو رہے ہیں ان میں اپنے نصف بہتر کو گھر سے باہر نکال کر ان کو فعال اور متحرک بنایا گیا تو ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارا معاشرہ بھی صحت مند، توانا، خوشحال اور شاندار ہو سکتا ہے، ہم نے بھی گولڈا مائر، مسز اندرا گاندھی اور مسز تھیچر تیار کئے تو ہماری سیاست بھی بہت آگے بڑھ سکتی ہے مگر ممکن ہے کہ یہ محض خیالی جنت ثابت ہو، کیونکہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم جو سمجھیں یا خواہش کریں وہ ہو بھی جائے۔

پردہ کے حامی صدیوں کے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک کا معاشرہ خوشحال اور مادی حیثیت سے شاندار ضرور ہے، مگر وہ توانا اور صحت مند اس لئے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں کی بے پردگی کی وجہ سے ان کی خانگی، خاندانی، اخلاقی اور روحانی مسرتیں چھین لی گئی ہیں، اور کیا یہ تصور کرنا صحیح ہوگا کہ ہر زمانہ میں مسز تھیچر اور مسز اندرا گاندھی پیدا ہوتی رہیں گی۔ انگلستان میں وزارت عظمیٰ کے لئے کوئی ڈسرائیلی، کوئی گلیڈاسٹون، کوئی چمبرلین، کوئی چرچل اور اٹیلی تو پیدا ہوتا رہے گا، لیکن ایک مسز تھیچر صدیوں کے بعد ہوئی ہیں، اور شاید صدیوں کے بعد ہی دوسری مسز تھیچر پیدا ہوں، ہندوستان کی پوری تاریخ میں صرف ایک مسز اندرا گاندھی پیدا ہوئیں، اس کی تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانہ میں ہندوستان میں کوئی نہ کوئی مرارجی ڈیسائی اور چرن سنگھ پیدا ہوتے رہیں گے مگر شاید دوسری مسز اندرا گاندھی نہ پیدا ہو، مسلمانوں کی تاریخ میں

ولید بن عبدالملک، ہارون رشید، عبدالرحمٰن ناصر، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شمس الدین التمش، اکبر، شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے حکمراں پیدا ہوئے ان پر مسلمانوں کو آج تک ناز ہے۔ مگر اس پایہ کی کوئی مسلمان عورت حکمراں نہیں گزری۔ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی قرار دیا ہے کہ وہ جلیل القدر فرمانروا کیا بلکہ انبیاء پیدا کر سکتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی کو نبوت نہیں دی، عیسائیوں نے حضرت مریمؑ کو تثلیث کے ذریعہ سے الوہیت کا درجہ دیا لیکن کلام پاک نے اس کی نفی پورے طور پر کی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت مریم کے بطن سے بن باپ کے حضرت عیسیٰؑ کو پیدا کیا، لیکن حضرت مریمؑ کو نبوت عطا نہیں کی، نسوانیت کی تکمیل بلکہ معراج اسی وقت ہوتی ہے جب عورت کی گود بھر جاتی ہے، خواہ یہ گود بھرنے والا آگے چل کر نبی ہو، یا فلسفی یا ادیب یا مورخ یا سائنسداں یا دفتر کا ادنیٰ کلرک۔ یا فیکٹری کا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔

پردے کے حامی اپنے ماضی کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ عورتوں کی خانہ نشینی کی وجہ سے معاشرے کے توانا، تندرست، خوشحال اور شاندار ہونے میں کب رکاوٹ ہوئی۔ بنو امیہ نے جو عرب امپائر بنایا، تو اڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ یہ دو سو دن میں طے ہوتا تھا اس کی سرحد ہندوستان اور تاتاریوں کے علاقہ سے پھیل کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک تھی، بنو امیہ کی ایک شاخ نے اندلس میں جا کر حکومت قائم کی، تو بقول موسیو لیبان یہ یورپ کی حکومت کی سرتاج بن گئی، بنو عباس کے بعض حکمرانوں نے رومن امپائر سے ٹکر لے کر ان کو جزیہ اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، دولت عثمانیہ نے تو رومن امپائر کو ختم ہی کیا، اور ان کا امپائر رومن امپائر سے زیادہ شاندار بن گیا تھا، ہندوستان کی مغل حکومت بقول کے۔ ام پینکر شاہ جہاں کے دور تک آتے آتے دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور ترین اور متمدن ترین حکومت بن گئی تھی، ان تمام حکومتوں کے زمانہ میں عورتیں چراغ خانہ ہی بنی رہیں، میدان جنگ یا دفتروں یا کارخانوں میں کام کرتی نہیں پائی جاتی تھیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظر اسلام کی پوری تاریخ پر رہی، اس لئے انھوں نے عورت کی تخلیق کا مقصد امومت قرار دیا ہے، جس کی تکمیل جلوت کی ہوس میں نہیں بلکہ خلوت کی خودگیری میں ہوتی ہے، ان کے نزدیک امومت اپنی تکمیل کے بعد شفقت پیغمبری سے قریب ہو جاتی ہے، اور اسی امومت سے قوموں کی سیرت بنتی ہے، کہتے ہیں :

نیک اگر بینی امومت رحمت است   زانکہ اورا با نبوت نسبت است

شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است   سیرتِ اقوام را صورت گر است

از امومت پختہ تر تعمیر ما   در خط سیمائے او تقدیر ما

(رموز بے خودی ص ۱۴۹)

اقبال نے اسلامی احکام ہی کے مطابق یہ قرار دیا ہے کہ عورت کا اصلی نگہبان مرد ہی ہوتا ہے، کہتے ہیں :

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور   کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی   نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا   اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

مگر مرد کی نگہبانی میں رہنے والی عورت ہی مردوں کی سیرت بنانے والی، ان کے ناموس کا پردہ رکھنے والی قوت دیں، اساس ملت اور امینِ نعمت دین حق اور سوز دیں ہوتی ہے۔ مخدرات اسلام سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں :

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما   تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

طینتِ پاک تو ما را رحمت است   قوت دین و اساسِ ملت است

کودکِ ما چوں لب از شیر تو شست   لا الٰہ آموختی اورا نخست

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق　　در نفس ہائے تو سوزِ دینِ حق

(رموزِ بے خودی ص ۱۵۴)

اقبال کے نزدیک مخدرات اسلام سے مراد وہ خواتین ہیں جو چراغ خانہ بنی رہیں، وہ نہیں ہیں جو شمعِ محفل بننے کی کوشش کرتی ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

وان تہی آغوشِ نازک پیکرے　　خانہ پرورد نگاہش محشرے

فکر او از تابِ مغرب روشن است　　ظاہرش زن باطنِ او نازن است

(رموزِ بے خودی ص ۱۵۰)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ پردہ سے متعلق احکامِ الٰہی ہوں یا حکیم الامت کی فلسفہ طرازی ہو اس پر تھوڑی دیر کے لئے مذاکرہ، مناظرہ، مجادلہ اور مباہلہ تو کر لیجئے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں بے پردگی کی جو لہر نہیں بلکہ جو سیل رواں چل کھڑا ہوا ہے وہ روکے نہیں رک سکتا، اسلامی ممالک کی عورتوں کی اکثریت باہر نکل پڑی ہے اور وہ زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ مردوں کی طرح اشرف المخلوقات میں داخل ہیں تو کیوں نہیں کائنات کی کھلی فضا میں کائنات کی تمام چیزوں سے مستفید ہوں، وہ چہار دیواری کے اندر کیوں رہیں، عورت اپنے جسم کی ساخت اور دوسری حیثیت سے مردوں سے چاہے مختلف کیوں نہ ہو، وہ جب مردوں ہی کی طرح شہسواری کر سکتی ہے، موٹر چلا سکتی ہے پائلٹ بن سکتی ہے، بندوق چلا سکتی ہے، پیر کر دریا عبور کر سکتی ہے، ہاکی کھیل سکتی ہے، سیاست کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے، تصنیف و تالیف افسانہ و ناول لکھ سکتی ہے، سائنس کے تجربات میں حصہ لے سکتی ہے ملک کے فلاحی کاموں کو بہتر سے بہتر انجام دے سکتی ہے تو وہ چہار دیواری کے اندر صرف امومت کے فرائض کیوں انجام دینے پر قناعت کرے۔ کیوں نہیں مردوں کی طرح زندگی کے تمام لذائذ سے متمتع ہو۔ ان کی لئے اخلاقی اور معاشرتی قدریں مردوں سے مختلف کیوں متعین کی جائیں، وہ ان کے تردیدی جواب

سننے کے لئے تیار نہیں، بلکہ وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ بے پردگی میں بھی وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں جو اسلام چاہتا ہے۔

زمانہ ان کے حق میں قیامت کی طرح چل چکا ہے، اس لئے اب احکامِ الٰہی کے پابند بٹے ہوں گے زمانہ کو آیندہ کی نئی نسلوں کے حوالہ کر دیں کہ وہ انتظار کریں، اور دیکھیں کہ بے پردگی سے جو معاشرہ آئندہ کے لئے بنے گا اس میں عورتیں، خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، زینبؓ، ام اشمار، ام سلیط، ام سلمہؓ، ام عطیہؓ، اور ام عمارہؓ وغیرہ بن کر رہیں گی، ان کے بیٹے ان کی نافرمانیوں کو حرام قرار دیں گے، ان کی بیٹیاں اپنے باپ کو قیامت کے روز رسول اللہؐ کے ساتھ چلتے دیکھیں گی، وہ مردوں کی ناموس کی پردہ دار ہوں گی سرمایۂ ناموس کی تاب، دین کی قوت اور ملت کی اساس ثابت ہوں گی، یا بے پردگی سے ایسا معاشرہ بنے گا جس میں یہ عورتیں مردوں کی محض ذوق نظر اور سوز جگر کی تسکین بن کر رہ جائیں گی، یا یہ معاشرہ مرد مؤنث۔ زن مذکر بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ، کورٹ شپ آزادانہ خوش وقتی، عریانی، جوڑواں ناچ، کنواری مائیں، حسن گاہوں، بانہوں کو خوبصورت بنانے اور بال سنوارنے کی دوکانوں پالش کدوں، حسن کی نمائش کے بے پناہ جذبہ، فیشن کے قیمتی لباسوں اور حسن افزائی کے مختلف النوع سامانوں کی حرص کا معاشرہ ہو جائے گا، زمانہ خود بتائے گا کہ آئندہ کون سا معاشرہ مرتب ہو کر رہے گا۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش　　مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خرد مند

ادبیات

غزل

از جناب بسنت کمار ایڈوکیٹ، ڈکاب گنج، لکھنؤ

منزل پہ کھینچ لائی رہِ پرخطر مجھے
رہزن ملے تھے یوں تو کئی گام پر مجھے

آیا جو میکدے میں تو چھلکنے لگے ہیں جام
اٹھا تو دیکھنے لگے دیوار و در مجھے

دیر و حرم سے کوچۂ جاناں کو لے گیا
لے جائے گا کہاں یہ فریبِ نظر مجھے

میں ہم کلام جلوۂ نورِ ازل سے ہوں
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی بے خبر مجھے

لبریز مے سے ہوگئے پیمانہ و سبو
جب وہ نگاہِ مست اٹھی دیکھ کر مجھے

وہ راہرو ہوں جس کی ہو منزل کو جستجو
آواز دے رہی ہے ہر اک رہ گذر مجھے

ترکِ تعلقات بجا ایک شرط ہے
آنا نہ اب سے یاد کبھی بھول کر مجھے

میں نے کیا سوال نظر سے تو ہنس دیئے
کیا مختصر ملا ہے جوابِ نظر مجھے

دیکھا مجھے تو دیکھ کے چپ ہو گئے ہیں وہ
انجان بن گئے ہیں وہ پہچان کر مجھے

منزل نے بڑھ کے چوم لئے راہ میں قدم
عزم و یقیں نے دے دیا رختِ سفر مجھے

یہ ہے نصیب اپنا یہ ہے اپنی اپنی بات
اُن کی خوشی ملی تو ملی چشمِ تر مجھے

آنسو بہا کے جبھوتے مجھے بس میں کر لیا
جادو جگا کے چپ ہے تری چشمِ تر مجھے

مدت سے تھا تلاش میں شیخِ حرم کی میں
ڈھونڈا تو میکدے میں کل آیا نظر مجھے

ترکِ تعلقات پہ پچھتا رہے ہو کیوں
کیوں یاد کر کے روتے ہو شام و سحر مجھے

چلتا رہا میں راہِ صداقت پہ اے بسنت
بہکا سکے نہ راہزن و راہبر مجھے،

مطبوعات جدیدہ

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ اوّل، دوم و سوم مرتبہ جناب ثروت صولت صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات بالترتیب ۴۰۰، ۵۵۶، ۴۴۲، قیمت: ۳۶ و ۴۲ و ۳۶ روپے، پتہ: اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ، ۱۳-ای شاہ عالم مارکٹ، لاہور، پاکستان۔

جناب ثروت صولت پاکستان کے اچھے اہل قلم ہیں، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، اسلامی تاریخ اور دنیائے اسلام کے حالات و مسائل ان کی دلچسپی اور توجہ کا خاص موضوع ہیں، انھوں نے اس کتاب میں ملت اسلامیہ کی سرگذشت اور روداد قلمبند کی ہے، اس اعتبار سے یہ گذشتہ چودہ سو برس کی مسلم حکومتوں کے اہم واقعات و حالات کی تاریخ اور ان کے عروج و زوال کی داستان ہے، جو چار حصوں میں مکمل ہوگی، ہمارے پیشِ نظر تین حصے ہیں، پہلا حصہ ۲۲ ابواب کا مجموعہ ہے، یہ ساتویں صدی ہجری کے نصف تک کے واقعات پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا آغاز اسلام یعنی عہد نبوی سے ہوئی ہے اور خاتمہ زوالِ بغداد پر ہوا ہے۔ شروع میں اسلام سے پہلے کے بعض مذاہب اور دنیا کے حالات کا ذکر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی کے ضمن میں آپ کے مختصر سوانح اور کارنامے بھی تحریر کئے ہیں، ایک باب میں مدینہ کی اس ریاست اور معاشرہ کے خط و خال کا تذکرہ اور اس کی نمایاں خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا اور جس کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر مبنی تھی، پھر خلافت راشدہ اور اس عہد کی فتوحات اور اہم کارناموں کا ذکر ہے، اسی جلد میں اموی و عباسی سلطنتوں، غزنویوں، سلجوقیوں اور غوریوں کے واقعات کا تذکرہ ہے، آخر میں اندلس میں اموی

حکومت کے قیام وزوال، مشرق میں عباسیوں کی حکومت کے خاتمہ، سقوط بغداد اور منگولوں کے حملے کا ذکر ہے، بغداد کے عروج کے عنوان سے ۲ ابواب میں عباسیوں کے عہد میں مختلف حیثیتوں سے اس کی ترقی دکھائی گئی ہے، آخری باب "مسلمانوں کے عروج کے دور اول کے خاتمہ" میں اس پورے عہد کی مجموعی خوبیوں اور خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے، دوسری جلد ۳۶ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں مسلمانوں کے زیر نگیں ملکوں اور حکومتوں کی اس زمانہ تک کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، جب ان پر غیر مسلموں کا تسلط و اقتدار قائم ہوا، اس طرح اس جلد میں ساتویں صدی کے نصف آخر سے بارہویں صدی کی ابتدا تک کے واقعات زیر بحث آئے ہیں، اس کی ابتدا چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے تذکرہ سے ہوئی ہے، اس میں پہلے ایلخانی حکمرانوں، وسط ایشیا کے تیموری فرمانرواؤں، مصر کے ملوک سلاطین، شمالی افریقہ کے موحدین، مشرقی افریقہ اور مشرق بعید میں اسلام کی اشاعت اور وہاں کی مسلم حکومتوں کا تذکرہ ہے اور آخر میں سلاطین دہلی، دولت عثمانیہ، وسط ایشیا کے ازبک اور ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کا ذکر ہے، مغلوں کے انحطاط اور یورپ کے عروج کے ضمن میں محمد شاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک کا تذکرہ ہے اسی سلسلہ میں شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد، نادر شاہ اور احمد شاہ قاچار اور افغانی حکمرانوں احمد شاہ ابدالی وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں آل عثمان کے زوال اور شمالی اور مغربی افریقہ پر انگریزوں کے تسلط کا حال بیان کیا ہے، اور آخری باب "اسلامی دنیا کی بیداری" میں محمد بن عبدالوہاب سعودی حکومت، سنوسی تحریک اور جمال الدین افغانی کی اصلاحی کوششوں کا ذکر ہے، تیسری جلد میں موجودہ دور کے مسلم ملکوں کی تاریخ پیش کی گئی ہے، اس میں انڈونیشیا، ملیشیا، برونئی، پاکستان بنگلہ دیش، کشمیر، افغانستان، ایران، ترکی، عراق، شام، لبنان اور اردن کی حکومتوں کے موجودہ حالات ومسائل پر بحث وگفتگو کی گئی ہے، باقی ملکوں کا تذکرہ چوتھی جلد میں ہوگا، پہلے بطور پس منظر اسلامی تاریخ کے امتیازی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، پھر مغربی واسلامی نظریات کے تصادم پر گفتگو کی ہے، آخر

میں اسرائیلی حکومت کے قیام، اسرائیلی جارحیت اور فلسطینی تحریک اور اس کے لیڈروں کا ذکر ہے، تینوں جلدوں کے ساتھ متعدد نقشے بھی جابجا شامل ہیں جن سے اسلامی تاریخ کے گذشتہ اور موجودہ واقعات وغیرہ کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے، گو مصنف نے واقعات کو سمیٹ کر اختصار سے لکھا ہے تاہم آغاز اسلام سے اب تک کے ہر اس خطے کی اس میں تاریخ آگئی ہے جہاں مسلمانوں نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ صرف فتوحات کی داستان، حکومتوں کی تاریخ اور سیاسی واقعات کی کھتونی ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی علمی، ادبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ بھی ہے، اس طرح لائق مصنف نے رزم میں بزم کی شان پیدا کردی ہے، تاریخ اسلام پر عربی، اردو، انگریزی ہر زبان میں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر یہ کتاب یک گونہ منفرد نوعیت کی ہے، مصنف کے نزدیک مسلمانوں کی تاریخ ایک تحریک کی تاریخ اور ایک نظریے کے عروج وزوال کی داستان ہے، انھوں نے اپنے قارئین کو دعوت دی ہے کہ وہ اس تاریخ کا مطالعہ ان اصولوں کی روشنی میں کریں جن پر ملت اسلامیہ کی بنیاد ہے، اور دیکھیں کہ مسلمانوں نے کہاں کہاں ان اصولوں پر عمل کیا ہے اور کہاں کہاں ان سے انحراف کیا ہے، انھوں نے اسلامی تاریخ کے مطالعہ میں اسلام ہی کو معیار بنانے پر زور دیا ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر کے بجائے قوم پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرنے کی مذمت کی ہے، وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے حامل مسلمانوں کے بعض نامور اشخاص اور حکمرانوں کے کارناموں کو صرف اس لئے سراہنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کہ وہ غیر قوم کے مقابلے میں انجام دیئے گئے ہیں، کتاب علمی حیثیت سے چاہے زیادہ بھاری بھرکم نہ ہو مگر مفید معلومات پر مشتمل اور اس لائق ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کی جائے۔

تصوف کی تین اہم کتابیں: ازمولانا سید احمد عروج قادری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت: ساٹھ روپے پچاس پیسے، پتے:- (۱) مرکزی مکتبہ اسلامی، چتلی قبر، دہلی ۶ (۲) کرسینٹ پبلشنگ کمپنی ۳۵-۳۴-۲۰ گلی قاسم جان دہلی ۶،

مولانا سید احمد عروج قادری مدیر رسالہ زندگی رامپور کو تصوف سے اشتغال و مناسبت بھی ہے، اور وہ صاحبِ نسبت و تعلق بھی ہیں، مگر وہ خالص اسلامی تصوف اور اس کی خوبیوں کے جہاں مداح و معترف ہیں، وہاں مروجہ تصوف اور اس کے بعض اعمال و اشغال اور نقائص کے ناقد بھی ہیں، اسی حیثیت سے اس کتاب میں انھوں نے تصوف کی مندرجۂ ذیل تین اہمات کتب کا جائزہ لیا ہے (۱) کشف المحجوب (حضرت سید علی ہجویریؒ) (۲) فوائد الفواد (ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ) (۳) مکتوبات امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، لائق مصنف نے ان کتابوں کے بارہ میں اپنے مطالعہ کے نتائج پیش کئے ہیں، پہلے انھوں نے ان کتابوں کا مختصر تعارف کرا کے ان کی اور ان کے مصنفین کی عظمت بیان کی ہے، پھر ان کے مندرجات کا جائزہ لیکر ان کی بعض مفید اور قیمتی بحثوں کو نقل کیا ہے، آخر میں ان کتابوں کے بعض ایسے مندرجات کی نشاندہی کی ہے، جو ان کے نزدیک کتاب و سنت کی تصریح اور اسلامی تعلیم و ہدایت کے منافی ہیں، اس سلسلہ میں ان کتابوں کی بعض بے سروپا حکایتوں اور روایتوں کی تردید بھی کی ہے، کتاب کا خاتمہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے ایک بیان کی تردید پر ہوا ہے، جو حضرت مجدد صاحبؒ کی مدح و منقبت پر مشتمل ہے، ممکن ہے مصنف کے بعض خیالات سے کچھ لوگوں کو اتفاق نہ ہو، مگر ان کا یہ موقف درست ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کے مندرجات کے رد و قبول کا معیار کتاب و سنت کو بنایا ہے جو نہ صرف تصوف بلکہ دوسرے فنون کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی صحیح و صائب معیار و اصول ہے۔

تحفۃ اہل الفکر فی مصطلح اہل الاثر (عربی): مرتبہ مولوی عبد الرحمن عبید اللہ رحمانی مبارکپوری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مکتبہ رحمانیہ، رانی پور، اعظم گڈھ، اتر پردیش۔

مولوی عبد الرحمن مبارکپوری نے اپنے والد بزرگوار مولانا عبید اللہ رحمانی کے ایماء سے یہ رسالہ

لکھا ہے، اس میں حدیث کے مصطلحات کی تعریف و توضیح کی گئی ہے، یہ دراصل ان کے والد ماجد کی مہتم بالشان تصنیف مرعاۃ المفاتیح کا دیباچہ ہے جو حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کی مبسوط شرح ہے، مصنف نے عام فائدہ اور طلبہ حدیث کی سہولت کے لئے اسے علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی شائع کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ دوسرے اڈیشن میں مزید وضاحت کے لئے مصطلحاتِ فن کی مثالوں کا اضافہ بھی کریں گے، اصول و مصطلحاتِ حدیث پر متعدد رسالے لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ ان میں ایک اچھا اضافہ ہے جو حدیث کے طلبہ کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

میری سیاسی سرگذشت: مرتبہ جناب مظفر حسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶ مجلد مع گردپوش، قیمت پندرہ روپے، پتہ: از مصنف، لال باغ، لکھنؤ۔

جناب مظفر حسن شروع ہی سے کانگریس سے وابستہ تھے، ایک زمانہ میں وہ صوبائی کانگریس کے سرکردہ لیڈر اور اتر پردیش حکومت کے اہم وزیر خیال کئے جاتے تھے، یہ کتاب ان کی گذشتہ سیاسی سرگرمیوں کی داستان ہے، اسکی ابتدا ہوم رول لیگ سے ہوئی ہے، اسکے بعد خلافت، نان کوآپریشن اور کانگریس کی ہنگامہ آرا اور انقلابی جد و جہد کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں جماعتی اور اسمبلی انتخابات، مسلم لیگ اور خود کانگریس کے مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اس سرگذشت کا خاتمہ کانگریس کے ۲ حصوں میں منقسم ہونے اور جنتا پارٹی کی تشکیل اور اسکے افسوسناک انتشار پر ہوا ہے، مصنف کانگریس کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو نام و نمود اور عہدہ و منصب کے لئے بھاگ دوڑ کرنے کی بجائے بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی کو ہر چیز پر مقدم خیال کرتی تھی، اس لئے یہ سرگذشت اصلیت اور واقعیت پر مبنی ہے، البتہ مصنف کا تعلق الہ آباد سے ہے، اس لئے انکی سرگذشت کا خاص محور یہ اور اسکے متصل اضلاع ہی ہیں، تاہم اس میں صوبہ کانگریس کے اکثر مشہور قومی کارکنوں کا بھی

تذکرہ ہے، یہ اتفاق ہے کہ ہندوستان کے دو گذشتہ اور موجودہ وزیر اعظم اور کئی اہم لیڈروں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے، مظہر صاحب نے ضلع اور صوبہ کی سطح پر ان سب سے اپنے اتفاق واختلاف کی تفصیل بھی کہیں کہیں دی ہے، وہ ایک پرانے اور تجربہ کار قومی کارکن ہیں، اس لئے مختلف اشخاص اور مسائل کے بارہ میں ان کی رائے باوزن ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لال بہادر جی کی عجب شخصیت تھی، ہم لوگوں سے پوری ہمدردی رکھتے اور ان لوگوں سے خفا، وہ لوگ بھی ہم سے کم ان سے برگشتہ نہ تھے، لیکن شاستری جی کی کیا مجال کہ پنڈت جی نے کبھی ہماری صفائی میں یا ان کے خلاف منھ سے کچھ نکالتے، ہمارے خلاف قدم اٹھانے میں بھی دریغ نہ کرتے وہ تو لیڈر کے چشم وابرو کو دیکھ کر اسی کے مطابق قدم اٹھاتے، شاستری جی نے جو اتنی بڑی ترقی کی اس کا بس یہی راز تھا، یہاں سے اوپر تک جو بھی پارٹی بندی ہوئی دونوں طرف بڑے مٹھاس کا تعلق رکھتے اور کافی خاکساری دکھاتے، پھر پارٹی بندی کا پورا پورا فائدہ انھیں کو ملتا،" (ص ۵۳)

جنتا پارٹی کے انتشار اور اس کے بعض لیڈروں کے خط وخال نمایاں کرتے ہوئے بھی بڑی بے لاگ رائے دی ہے، مصنف کی پوری زندگی سیاسی ہنگاموں میں گذری، تصنیف وتالیف ان کا مشغلہ نہ تھا، اس لئے چاہے یہ کتاب زیادہ مربوط نہ ہو مگر اس سے گذشتہ قومی جدوجہد اور سیاسی مدوجزر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

نغمہ کتے: مرتبہ جناب عروج زیدی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۳۶ مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت بیس روپئے، پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶ (۲) نصرت پبلی کیشنز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، (۳) سید عرفان علی زیدی، محلہ کٹ کوئیاں، رامپور، یوپی۔

جناب عروج زیدی اردو کے معمر اور مشاق شاعر ہیں، اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ انھیں نثر نگاری کا بھی اچھا سلیقہ ہے، اس میں انھوں نے اردو کے مندرجۂ ذیل چھ شاعروں کے بارے میں اپنے تاثرات ومشاہدات قلمبند کئے ہیں، (۱) شاد عارفی، (۲) جگر مرادآبادی، (۳) نوح ناروی، (۴) راز یزدانی، (۵) شفیق جونپوری، (۶) ماہر القادری، ایسے ممتاز اور مخصوص ودلکش طرز تغزل کے حامل شعرا کو موضوع بنانا بھی عروج صاحب کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے، یہ کتاب محض ان کے دلچسپ تاثرات ومشاہدات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں مذکورۃ الصدر شعرا کی سرگذشت حیات بھی قلمبند کی ہے، اور ان کی ادبی وفنی حیثیت واہمیت بھی واضح کی ہے، لائق مصنف کے ہر شاعر کے بارہ میں مختصر مگر جچا تلا جو تبصرہ کیا ہے، اس سے ان کے اچھے ادبی ذوق اور ادب وزبان کے نکتوں سے واقفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اس طرح یہ شعراء کا ایسا خاکہ ہے جو دلچسپ اور معلوماتی ہونے کی بناپر ارباب ذوق کے لئے خاصے کی چیز ہے، مصنف کی تحریر کی شگفتگی اور طریقہ ادا کی رعنائی بھی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

سطح آئینہ: مرتبہ جناب فیاض ہاشمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۰۴ مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۲ روپیے، پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷ سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴۔

جناب سہیل واسطی مرحوم اچھے ادیب وشاعر تھے، ان کو غزل گوئی سے زیادہ مناسبت تھی مگر ان کی نظمیں بھی خاصے کی چیز ہیں، یہ مجموعہ نظموں ہی پر مشتمل ہے، اس سے ان کی حساس طبیعت دردمند دل، نظر ومشاہدہ کی قوت اور عہد وماحول سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، یہ نظمیں ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دور حاضر کے لوگوں کے اصلی خط وخال دکھائی دیتے ہیں، اس میں دراصل انسانی ذہن وخیال اور فکر ورجحان کی موجودہ پستی، اخلاقی ومعاشرتی انحطاط اور سماج کے مختلف طبقوں

کی زندگی کی ناہمواری اور کجی کی عکاسی مؤثر اور عبرتناک انداز میں کی گئی ہے اور مذہبی و سیاسی لوگوں کے قول و عمل میں تضاد، مکر و فریب، داؤں پیچ اور ریا و نمود کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، انھوں نے حالات کے گھناؤنے پن ہی کو دکھانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کا انسانی ہمدردی سے معمور دل ان پر اپنے کرب کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ مجموعہ مصنف کی نظر ثانی کے بغیر شائع ہوا ہے اس لئے اس میں کہیں کہیں زبان و طریقہ ادا کی خامیاں بھی ہیں، تاہم اس میں ظاہر کئے گئے خیالات و جذبات نیک ہیں، مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی یہ ادب نوازی لائق تحسین ہے۔

جنوبی ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر) مرتبہ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۶، قیمت غیر مجلد: ۱۵ روپے، لائبریری اڈیشن ۱۸ روپیے، پتے: (۱) بک ڈپو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدر آباد دکن، (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو صحافت پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں جنوبی ہند کی قدیم صحافت پر کم لکھا گیا ہے اس کتاب میں وہاں کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو صحافت کا ذکر ہے، پہلے صحافت کی اہمیت، دنیا کی مختلف زبانوں میں اسکی ابتدا کا ذکر اور ہندوستان و جنوبی ہند میں انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں صحافت کے آغاز اور ہندوستان کے فارسی اخبارات کا تذکرہ ہے، اسکے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کے آغاز، اس زمانہ کے اخبار اور مختلف جگہوں میں اردو صحافت کی روداد قلمبند کی ہے، پھر جنوبی ہند میں اردو صحافت کی ابتدا اور مدراس سے ۱۸۵۷ء سے شائع ہونے والے پندرہ اردو اخباروں کے متعلق معلومات درج ہیں، اسمیں ۱۸۵۷ء کے بعد کے دو اخباروں کا ذکر بھی اس لئے آگیا ہے کہ ان کے سنہ اشاعت کے بارہ میں غلط بیانی کی گئی تھی۔ مصنف نے ہر اخبار کی بارہ میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں اور اڈیٹر کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، آخر میں جنوبی ہند کے ۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو مطابع اور انکی خدمات و مطبوعات کا تذکرہ ہے، مصنف نے منتشر مواد کو سلیقہ اور محنت سے جمع کرکے اس پر اضافہ بھی کیا ہے اور بعض غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے، مگر اجرا کے بجائے کئی جگہ اجرائی لکھا ہے جو کھٹکتا ہے، "ض"

جلد ۱۳۴ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۴ء عدد ۲

مضامین